ام طیبہ طور

ستارے گواہ رہنا

تیسری قسط

"پاشا کاٹیج" کا لان بہت خوب صورت تھا۔ ناعمہ تنہائی کے بیشتر اوقات یہیں بتاتی تھیں۔ جب سے ان کی عادل پاشا سے شادی ہوئی تھی، انہوں نے اس لان میں بہت سی تبدیلیاں کروائی تھیں۔ باغبانی کا شوق اور ذوق رکھتی تھیں، وسائل ملے تو ہر نوع کا پودا لگوایا۔ اپنے ہاتھوں سے دیکھ بھال کی تھی۔ بچوں کی طرح برتاؤ کرتی تھیں، وہ پیڑ پودوں سے۔ عادل پاشا نے بھی ان کا شوق دیکھتے ہوئے باہر سے کئی قیمتی خوب صورت پھولوں والے پودے امپورٹ کروائے تھے۔ عام لانز کی نسبت اس لان میں بیچوں بیچ بڑی نفیس روش بنی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ گول دائرے کی صورت ٹف ٹائلز جگہ جگہ نظر آتے تھے جن کے اطراف میں بوٹے سے قد کی باڑھ اگی ہوئی تھی جو دیکھنے میں بے حد خوش نما لگتی تھی۔

کچھ دیر پہلے ہی عادل پاشا آفس سے گھر پہنچے تھے۔ ناعمہ ان کے آتے ہی چائے لے آتی تھیں۔ عادل پاشا چائے کے نشے کی حد تک شوقین تھے اور گھر آتے ہی پہلی فرمائش ان کی ایک کپ گرما گرم چائے ہوتی۔ ناعمہ بڑی محبت سے ان کے لیے چائے بناتیں اور ساتھ بیٹھ کر پیتی بھی تھیں حالانکہ وہ خود چائے کی ہرگز رسیا نہیں تھیں مگر شوہر کی دلداری انہوں نے خود پر فرض کر رکھی تھی۔

عادل پاشا سے شادی کے بعد بہت سے ایسے کام تھے جو وہ نہیں کرتی تھیں مگر اب وہ ان کی عادات میں شامل تھے، بھلے مجبوری سے سہی یا خوشی سے۔

عادل پاشا چائے پینے کے بعد اپنے کمرے میں فریش ہونے کے لیے چلے گئے تو ناعمہ ملازم سے برتن اٹھانے کا کہہ کر لان میں نکل آئیں۔ لان میں قدم رکھنے سے پہلے ہی مالی اصغر نے فٹافٹ پانی کا پائپ لپیٹا اور لان چیئرز سیٹ کر دیں۔ ناعمہ کی پلکیں یکبارگی بھیگ سی گئیں۔ ایک وقت تھا جب ان کے پاس کچھ نہیں تھا، لیکن دل پرسکون تھا اور اب

مکمل ناول
RDU TUBE

جب کہ ان کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کے لیے انہوں نے اپنے دل کے ٹکڑے کیے تھے تو ان کا دل ان سب میں نہیں لگتا تھا۔ بلکہ نظروں کے سامنے ہر وقت اپنے ان پیاروں کی شکلیں رہتی تھیں جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آئی تھیں۔ ماضی کا یہ دریچہ کبھی بند ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اب جینے کے لیے آکسیجن انہیں اسی دریچے سے مہیا ہوتی تھی۔

بظاہر پودوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتیں، وہ سوچوں کے الجھے ریشم کا سرا ڈھونڈ رہی تھیں جب عادل پاشا نے اچانک پیچھے سے ان کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے۔ وہ چونک کر مڑیں۔

''کدھر کھوئی ہوئی ہیں آپ ناعمہ! کب سے ایک ہی بیل کے پتے کو سہلائے جا رہی ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ مجھے آپ کی ایسی غیر حاضر دماغی نہیں پسند۔ پھر بھی۔'' عادل پاشا کے نرم لہجے میں ایک محسوس کی جانے والی تنبیہہ تھی۔ جسے ناعمہ نے فوراً محسوس کر کے اپنے چہرے پر بشاشت پیدا کی۔

''ارے نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہے پاشا! میں تو بس سالک کی شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' انہیں گھبراہٹ میں فوری یہی بات سوجھی۔

''آج وہ بچی آئی تھی۔ بڑا پیارا سا نام تھا۔ ہمم۔ ابرش۔ ابرش۔ کہہ رہی تھی، یہاں سے گزر رہی تھی تو یونہی مجھ سے ملنے کا جی چاہا۔ میں نے زبردستی چائے پر روک لیا۔ اتنی پیاری مزے مزے کی باتیں کرتی ہے وہ بچی۔ سچ میں پاشا! مجھے وہ بہت اچھی لگی سالک کے لیے۔ اس گھر کی رونق کو چار چاند لگا دے گی وہ۔'' عادل پاشا کا دھیان بٹانے کے لیے انہوں نے خاصی لمبی چوڑی تفصیل دے دی ورنہ آج جب ابرش واقعی ان کے گھر آئی تھی تو اس وقت ان کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ابھری تھی مگر اس وقت فر فر ان کے منہ سے یہ سب نکلتا چلا گیا۔ عادل پاشا بغور انہیں دیکھ رہے تھے۔ مسکراتے ہوئے بولے۔

''آپ نے تو اچھا مشورہ دیا ناعمہ! واقعی بچی تو بہت پیاری ہے۔ اور اس کے فادر سے میری خاصی اچھی سلام دعا ہے۔ اور اب تو ہماری بہت بڑی ڈیل فائنل ہوئی ہے ان کی کمپنی کے ساتھ۔ ہم! سو پرفیکٹ آئیڈیا۔ اس طرح تو ہماری ساکھ کو بھی تقویت ملے گی۔'' وہ بزنس مین تھے، ہر شے کو اسی پلڑے میں تولتے تھے۔ ناعمہ کو ان کی اس بات سے شدید کوفت ہوئی مگر کہا انہیں کہ اتنی جرأت نہیں تھی ان میں۔

''بس ٹھیک ہے۔ چند دن تک میں راٹھور سے بات کرتا ہوں سرسری سی۔ اس کے گھر آنے کی۔ پھر ذرا چل کر ان کا گھر بار بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد سالک سے بات کریں گے۔'' عادل پاشا نے چٹکیوں میں سب پلان کر لیا۔

''اور اگر سالک نہ مانا تو۔ وہ پہلے ہی شادی کی بات پر مجھ سے روٹھ چکا ہے۔'' ناعمہ کے لہجے میں مایوسیت تھی جسے عادل پاشا نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

''بی سینس ایبل ناعمہ۔ آپ ہر وقت نیگیٹو نہ سوچا کریں اور نہ ہی سالک کی باتوں کو اعصاب پر سوار کیا کریں۔ باقی رہا اسے منانے کا سوال، تو یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اگر یہ رشتہ مناسب ہوا تو پھر سالک کو یہیں شادی کرنی ہوگی۔ دیٹس فائنل۔'' ہمیشہ کی طرح دوٹوک انداز اور رعونت۔ ناعمہ، عادل پاشا کو دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ بہت اچھے تھے۔ خیال رکھنے والے اور احساس کرنے والے مگر تب تک، جب تک سب ان کی مرضی کے مطابق ہوتا رہے۔ اور آج تک سب کچھ ان ہی کی مرضی کے مطابق ہوا تھا۔ اس بات کو ناعمہ سے بہتر بھلا کون جانتا تھا۔

☆☆☆

عقیل مغل آج کچھ ہوش میں تھے اور وہ ہوش میں تب ہی ہوتے تھے جب نشے کے لیے پیسے پلے نہ ہوتے۔ ان کے تمام جسم میں اینٹھن تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے اپنے بدن کو کھجا رہے تھے۔ کبھی اپنی رانوں پر مکے برساتے۔

''ایسی اولاد سے اچھا تھا میں کتے پال لیتا۔ کسی کام کی نہیں۔ ہونہہ!'' قریبی صوفے پر بیٹھے

سیف نے پہلو بدلا

''ہائے۔ ہائے۔ کم بختو! مر چلا ہوں میں۔ کوئی تو آ کے پوچھ لو کہ مجھے کیا چاہیے۔ اوئے زید۔'' انہوں نے تیزی سے چکر کاٹتے ہوئے سیف کو پکارا۔ وہ اکثر اپنے ہی بچوں کے نام بھول جاتے تھے۔ یادداشت کو نشے نے چاٹ لیا تھا اور بچے اس رویے کے عادی۔ سیف نے آہستگی سے تصحیح کی۔

''سیف بابا۔ سیف۔'' وہ سیدھا ہو بیٹھا تو انہوں نے اس کے آگے رکھی تپائی کو زوردار ٹھڈا مارا۔

''خبیث، بدذات تجھے نظر نہیں آ رہا کہ باپ تکلیف میں ہے۔ نکال اگر کچھ پیسے ہیں تیرے پاس تو۔ نکال جلدی۔''

''ابھی نہیں ہیں بابا۔ مگر کل اسٹور سے تنخواہ ملنی ہے۔ تب دے دوں گا۔''

''در فٹے منہ۔ مر میں ابھی رہا ہوں اور تو مجھے کہہ رہا ہے کہ کل دوں گا۔ اتنا بڑا کیا پال پوس کر۔ اپنی ہڈیاں تک گلا لیں ان کے پیچھے اور یہ ہیں کہ باپ کی پروا تک نہیں۔ سب کے سب اپنی ماں پر پڑے ہیں۔ حرام.....'' کچن میں برتن دھوتی ماحور کا ضبط جواب دے گیا۔ بابا کی گالی کے بعد اور بہت کچھ تھا جو سیل رواں کی طرح ان کے منہ سے خارج ہونے کو بے تاب ہو جاتا لہٰذا چائے کا مگ سنک میں پٹختی وہ لاؤنج میں چلی آئی۔

''کتنے پیسے چاہئیں؟'' دوٹوک، سپاٹ انداز میں اس نے باپ سے پوچھا۔ عقیل متخمل تھوڑا گڑبڑائے مگر اگلے ہی پل تن کر بولے۔

''دے دو تین چار سو۔ کر لوں گا گزارہ۔ ویسے تو شرم آنی چاہیے تمہیں، مجھ سے پوچھتے۔ لیکن اب اولاد ہی ایسی بے غیر.....''

''یہ پکڑیں پیسے۔'' ماحور نے ان کے منہ سے نکلنا والا آخری لفظ مکمل ادا ہونے سے پہلے اپنے سویٹر کی پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو کا نوٹ ان کی طرف بڑھایا۔ عقیل مغل نے اسے یوں جھپٹا کہ کہیں ماحور کا ارادہ بدل ہی نہ جائے۔

''اور آج کے بعد۔ اگر آپ نے گھر کی کوئی چیز چرا کے بیچی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ آپ کو جب پیسے چاہیے ہوں، مجھ سے مانگ لیا کریں۔ میرے پاس ہوں گے تو ضرور دوں گی اور نہ دے سکی تب بھی آپ کو اس گھر کی ایک بھی شے لے کے جانے نہیں دوں گی۔ سمجھے آپ۔'' دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھا کر انہیں وارن کرتی ماحور کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔ وہ اس وقت اس قدر طیش میں تھی کہ اس کی بدتمیزی کو عقیل مغل نہ چاہتے ہوئے بھی پی گئے۔ نوٹ کو حریص نظروں سے دیکھتے اور چومتے وہ باہر نکلتے چلے گئے۔ جبکہ ماحور وہیں چیئر گھسیٹ کر ڈائننگ ٹیبل پر سر رکھے رو دی۔ سیف فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور محبت سے اس کا سر سہلانے لگا۔ ان بہن بھائیوں کو ایک دوسرے کا سہارا ہی بہت تھا۔ وہ بہت عرصہ ہوا ہر رشتے کا اصل چہرہ دیکھ چکے تھے۔ وہ خود ہی پلے تھے۔ اپنے دم پر۔ اکیلے۔

''بس کریں اپیا۔ کیوں رو رہی ہیں اس قدر۔ ابھی تو ہمارے اچھے دن شروع ہوئے ہیں۔ آپ سوچیں کہ کیا کبھی اس قابل تھیں کہ بابا کو پانچ سو اکٹھے دے پاتیں۔ آج ہیں تب ہی دیے نا۔ ان کے رویے کو دل پر مت لیں۔ وہ تو شروع سے ایسے ہی ہیں۔''

''میں ان کو پیسے دینے کی وجہ سے نہیں رو رہی سیف۔ مجھے بس وہ دن یاد آ گیا جس دن میں ابرش کے آفس جاب کے لیے گئی تھی۔ میرے ذہن میں اس قدر پریشانیاں تھیں کہ میں بھول چکی تھی کہ رائنہ نے مجھے وہاں اپلائی کرنے کے لیے کہا تھا۔ مگر بابا کی ایک حرکت نے مجھے آنے والے دنوں کا نقشہ دکھا دیا۔''

وہ جب روتی تھی تو آنسو ایک تار کی مانند آنکھوں سے بہا کرتے تھے۔ کبھی بھی یہ لڑی ٹوٹتی نہیں تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے اس دن کو ذہن میں دہرانے لگی، جس دن بابا نے پہلی بار اس کے ہاتھ

سے پیسے جھپٹے تھے۔

☆☆☆

''چار سو چھیاسٹھ روپے جمع تین سو بہتر۔ یہ ہوئے کل ملا کے۔'' وہ بہت مصروف سی پرانی سی ایک ڈائری پر حساب کتاب میں الجھی ہوئی تھی۔ کیلکولیٹر پاس رکھنے کے باوجود پیپر کی سائڈ پر ہی جمع تفریق کر رہی تھی۔ الجھے بالوں کا جوڑا بنا کر اس میں بڑی مہارت سے پنسل اٹکا رکھی تھی۔ دو تین چھوٹی بڑی لٹیں چہرے پر گر رہی تھیں جنہیں وہ ہر دو منٹ بعد بڑی کوفت سے کانوں کے پیچھے اڑستی اور اگلے ہی پل وہ پھر ٹوٹی شاخ کی مانند چہرے پر لہرا جاتیں۔ بے زاری اس کے نکھرے سفید رنگت والے چہرے کو پھیکا بناتی تھی۔ وگرنہ جس دم وہ ہنستی تھی، ساری فضا گویا تھمتی تھی مگر وہ ہنستی ہی کب تھی۔ اس کے گرد رہنے والے بھی پوروں پر گن کے وہ پل بتا سکتے تھے جب ماحور مغل کو کسی نے کھلکھلاتے دیکھا ہو اور پھر جب مہینے کی آخر آجاتی تو وہ گویا آتش فشاں بن جاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ بقایا جمع جتھا بائیں ہاتھ میں گنتی کے چند نوٹوں کو مضبوطی سے تھامے وہ یہ اندازہ کر رہی تھی کہ دودھ والے کا بل پہلے ادا کیا جائے یا پانی کا۔ اگر دودھ والے کو پیسے نہ ملتے تو اگلے مہینے دودھ بند اور اگر پانی کا بل جمع نہ ہوتا تو پانی بند۔ وہ بری طرح سے الجھی ہوئی تھی جب یک لخت اس کے ہاتھ سے کسی نے پیسے اچک لیے۔ اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

سامنے عقیل مغل مکروہ مسکراہٹ لیے قیمتی متاع کی طرح سنبھالے اس کے نوٹ گن رہے تھے۔ مارے طیش کے اس کا نفس پارے کی مانند تھرکنے لگا۔ وہ فوراً کرسی چھوڑ کر اٹھی اور اچک کر ان کے ہاتھ سے پیسے چھیننے کی کوشش کی، جسے انہوں نے ہاتھ پرے کر کے ناکام بنا دیا۔

''بابا! مجھے میرے پیسے واپس کریں۔ ابھی

کے ابھی ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ کریں۔''

''بکواس بند کرو۔ باپ ہوں تمہارا۔ تمیز بات کرو۔ آخر کھاتا ہی کیا ہوں میں تمہارا۔ آ ضرورت پڑ گئی مجھے۔ سگریٹ ادھار نہیں د جاوید۔ اس لیے بس یہ..... یہ..... ایک نوٹ ہوں۔'' عقیل مغل نے نرم اور بناوٹی لہجے میں ان پیسوں میں سے اکلوتا ہزار نوٹ گھسیٹا۔ مارے بسی کے ماحور کی آنکھیں چھلک گئیں۔ وہ آنسو گولا بمشکل حلق سے اتارتے التجائیہ انداز میں ہوئی۔

''بابا! بابا پلیز۔ یہ پیسے مت لیں۔ آپ کو واسطہ۔ میں وعدہ کرتی ہوں شام تک آپ کو کچھ دے دوں گی مگر ابھی یہ مجھے واپس کر دیں۔ آج دودھ کا بل جمع نہ کرایا تو اگلے مہینے سے دودھ آئے گا۔ پلیز بابا۔'' وہ ابھی بھی اچک اچک کر پکڑنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ عقیل مغل اس بات پر استہزائیہ ہنستے ہوئے بولے۔

''واہ بٹیا رانی۔ ایک نوٹ نے تمہیں میرے آگے شیرنی سے بلی بنا دیا۔ واہ بھئی واہ۔ ورنہ تم مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہو۔ ایک نوٹ نے آ تمہیں میری عزت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ہاہاہا۔ میں نہیں دینے والا واپس۔ بھلا آئی عزت کسے چھ دوں۔'' وہ نوٹ کو چومتے ہوئے دل جلاتی ہنسی ہنستے ہوئے بول رہے تھے۔ گدلی آنکھوں سے بہتے پانی انہوں نے اس نوٹ سے صاف کیا اور صدمے میں گھرے ماحور کے نیم جان وجود کو زوردار دھکا دے کر کرسی پر گراتے ہوئے بولے۔

''بیٹھ ادھر سمجھی۔ بڑا زعم ہے نا تجھے اپنی کمائی کا۔ کبھی باپ کو بھی کھلا تو مانوں نا۔ میرا حق بنتا ہے تیرے پیسوں پر اور آج میں اپنے حق کے پیسوں سے سگریٹ خریدوں گا۔ اخاہ! آج تو مزا آجائے گا۔ سب یاروں میں میری ٹور بن جائے گی جب جاوید ہیرے سے نقد سگریٹ لوں گا۔ سالا مفت خور

کہتا تھا مجھے۔ آج بتاؤں گا ہونہہ۔'' وہ اسے بے ردی سے کرسی پر پٹخ کر بکتے جھکتے باہر نکل گئے تھے۔ ساتھ اس کی انتہائی محنت کی کمائی بھی لے گئے تھے ''پھونکنے'' کے لیے۔ اور وہ لاچار بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔

باپ تھے، مرد تھے۔ اس سے کہیں زیادہ طاقت ور۔ وہ اکیلی بھلا ان سے کیسے چھینا جھپٹی کر سکتی تھی۔ ہاں اس وقت اگر سیف اور ریان گھر میں ہوتے تو عقیل مغل کو کبھی جرأت بھی نہیں ہوتی اس کے ہاتھ سے پیسے چھیننے کی۔ وہ دونوں کھال ادھڑوا لیتے مگر بہن کی محنت کی کمائی لٹانے کے لیے باپ کے ہاتھ میں نہ جانے دیتے۔ وہ بے بسی کی انتہا پر جاتے ہوئے پورے حلق سے چلائی اور ٹیبل پر سر رکھ کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہاتھ میں پکڑے چند لال نوٹ گر کر ادھر ادھر فرار ڈھونڈنے لگے۔ وہ بالکل بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ اونچی اونچی آواز سے۔ مچل مچل کر۔

خوب سارا رو چکنے کے بعد اس کا دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو سب سے پہلے اس نے گرے ہوئے باقی کے نوٹ اکٹھے کیے اور ان مسلے ہوئے نوٹوں کو سینے سے لگا کر ہتھیلی کی پشت سے اپنے گیلے گال بے دردی سے رگڑے۔

اس کا دماغ اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ نہ تو اسے گھر کا دودھ بند ہونے دینا تھا نہ پانی اور اس کے لیے اسے فوری طور پر کتنی رقم درکار تھی، اس کا اندازہ کر کے اس نے کچھ دیر پرسکون ہو کر سوچا اور پھر اگلے دس منٹ میں وہ تیار ہو کر اپنے ضروری ڈاکومنٹس ہاتھ میں لیے گھر لاک کر رہی تھی۔ چابیاں بیگ میں ڈال کر اس نے اسی بیگ کی اندرونی جیب سے رائنہ کا دیا ہوا کارڈ نکالا اور ایڈریس نوٹ کرنے لگی۔ رائنہ نے چار دن پہلے دیا تھا یہ کارڈ اور کہا تھا کہ اگلے دن دس بجے وہاں چلی جانا مگر کچھ گھریلو مسائل اور ریان کی چوٹ میں ایسی الجھی کہ وقت ہی نہیں نکال پائی تھی۔ جی کو دھڑکا سا بھی لگ گیا تھا کہ

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
چلمن

قیمت -/300 روپے
نادرہ خاتون
اور خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناول

دستِ مسیحا
نگہت سیما
400

آمنہ ریاض
قیمت -/300 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

کہیں رائنہ کی فرینڈ نے کسی اور کو نہ رکھ لیا ہو۔ پھر بھی دل میں ڈھیروں دعائیں مانگتی وہ ابرش راٹھور کے پاس جانے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔

''اگر اس دن میرے پاس رائنہ کا دیا کارڈ نہ ہوتا تو سوچو سیف! سوچو ہمارا کیا بنتا۔ ادھر ہم پائی پائی جوڑ رہے تھے کہ کسی طرح سے بجلی، پانی کے بل ادا ہو سکیں اور ادھر سب پیسے بابا نے چھین لیے تھے۔ مجھے ان سے بہت سے شکوے ہیں سیف مگر اس دن انہوں نے جو کیا وہ میرے اعصاب کو توڑ کر رکھ گیا۔ مجھے ان سے بے حد خوف محسوس ہوا۔ وہ اب ایسی اسٹیج پر آ چکے ہیں کہ اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے کسی بھی حد کو پھلانگ سکتے ہیں سیف۔''

وہ اسے ساری بات بتانے کے بعد اذیت سے آنکھیں میچے ہوئے تھی۔ سیف حیران تھا کہ ماحور نے اتنی بڑی بات اس سے کیونکر چھپائی۔ وہ تو چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس سے شیئر کرنے کی عادی تھی۔ اس نے ماحور کا سر محبت سے سہلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا اور تسلی آمیز لہجے میں مخاطب ہوا۔

''ہمیں ڈرنا نہیں ہے اپیا! مقابلہ کرنا ہے۔ ڈرنے سے ہم ان حالات سے دبتے چلے جائیں گے اور جہاں تک بابا کا سوال ہے تو ان کو روکنا مشکل ہے۔ بس ہمیں اپنی کمزوریاں ان کے ہاتھوں میں نہیں دینی۔ آپ کا خوف وہ بھانپ چکے ہیں۔ اگر آپ نے خود کو بہادر نہ بنایا تو وہ دوبارہ بھی ایسی ہی حرکت کر سکتے ہیں۔ اس لیے خود کو مضبوط کریں ورنہ ہم سروائیو نہیں کر پائیں گے۔''

وہ اس کا چھوٹا بھائی کتنی محبت اور پختگی کے ساتھ اسے سمجھا رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کی پشت کو چوما اور سر ہلا دیا۔ بھائی چھوٹے بھی ہوں تو بڑے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر مشکل میں بہنوں کی چھتر چھایا بن جاتے ہیں۔

☆☆☆

آفس چیئر پر آرام دہ انداز میں سالک پاشا بیٹھا تھا۔ رخ میز کے مخالف سمت بڑی سی گلاس وال کی طرف تھا، جہاں سے باہر کی روشن اور تر و تازہ فضا دکھائی دے رہی تھی۔ آج صبح سے ہوتی ہلکی بارش نے موسم کو کافی خوش گوار بنا ڈالا تھا۔ اسی کا اثر تھا کہ دل بھی ترنگ میں تھا۔ ویسے آگے پیچھے سالک ایسے موسموں سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا تھا، مگر اب سے پہلے آگے پیچھے کوئی تھا بھی تو نہیں۔

اس نے ذرا سا رخ پھیر کر ٹیبل سے کافی کپ اٹھایا اور واپس سیدھا ہو بیٹھا۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ذہن میں چند گزرے پل گردش کر رہے تھے۔

''بندہ دو منٹ انتظار ہی کر لیتا ہے۔ لفٹ مجھے باہر اگل کر آپ ہی کو نگلنا تھا پر صبر نامی شے تھوڑی کی صورت تھوڑی نا ملتی ہے ورنہ ہر شخص گلے میں لٹکا تو لیتا۔''

چمکتی صبیح پیشانی پر بل ڈالے ماحور اس کے سامنے کھڑی ہاتھ نچا نچا کر کہہ رہی تھی اور وہ حیرت سے کھڑا سن رہا تھا۔ سالک پاشا کے ہونٹوں کی مسکان مزید گہری ہوئی۔ اس نے کافی کی ایک طویل چسکی لی اور نچلا ہونٹ ذرا سا اندر دبائے، آنکھوں کو مست انداز میں سکوڑے وہ پھر سے اسے سوچنے لگا۔

''اوئے ہوئے! کتنے چالاک آدمی ہیں آپ۔ اس بہانے میرا نمبر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ توبہ توبہ۔ کیسی کیسی حرکتیں ایجاد ہو گئیں اور میں بس ذہن میں بٹھائے ہوئے ہوں۔ توبہ توبہ۔''

اب سالک کو ہنسی روکنے پر اختیار نہیں رہا تھا، اسے بہت بہت اچھا لگ رہا تھا، اس جنگلی پھول سی خوش نما لڑکی کے ہر انداز کو ذہن میں دہرانا۔ کچھ الگ سا ہی احساس تھا یہ۔ اس نے ایک بار پھر پلٹ کر ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھایا اور اگلے ہی پل سیوڈ نمبرز میں موجود اس کا نمبر نظروں کے سامنے تھا۔

''تو واقعی یہ چالاکی میں نے کر ہی لی ماحور صاحبہ! اگر اپ کو علم ہو جائے تو یقیناً کچا چبا جائیں

گی۔"

ایک محظوظ سا قہقہہ اس کے حلق سے برآمد ہوا اور اندر آتے مومن کو چونکا گیا۔

"ہائیں۔ سر کھسک گئے۔ اکیلے ہی ہنس رہے ہیں۔ دادا ہوں تو یہی کہیں کہ آسیب ہو گیا لڑکے پر۔ دھت تیرے کی۔" ساتھ ہی اس نے اپنی گردن کی پشت پر ہلکی سی چپت رسید کی۔ "عین دروازے پر کھڑا ہو کر بڑبڑا رہا ہے۔ بیٹا مومن، کسی دن تو مرے گا۔"

اور واقعی اس کی بڑبڑاہٹ نے سالک پاشا کو چوکنا کر دیا، اس نے ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کرسی گھمائی اور دونوں کہنیاں ٹیبل ٹاپ پر جما کر مستفسرانہ نظروں سے مومن کو دیکھنے لگا۔ کف کہنیوں تک فولڈ تھے۔ لائٹ براؤن سلکی بالوں میں مانگ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ لمبی پلکوں والی غلافی آنکھوں پر اسمارٹ سے ایش گرے گلاسز لگا رکھے تھے۔ مونچھیں گھنی تھیں مگر نفاست سے ترشی ہوئی۔ اور ہونٹوں کا رنگ۔ ہمم! ہونٹوں کا رنگ۔

"ابے پاگل ہو گیا ہے۔ مرد بن مرد۔ کیا لڑکیوں کی طرح باس کے "اجزائے ترکیبی" نوٹس کر رہا ہے۔ ویسے اپنا باس سالا ہے کمال۔" مومن پوری دل جمعی سے سالک پاشا کو جانچ رہا تھا لیکن شکر ہے کہ یہ بڑبڑاہٹ دل تک ہی محدود رہ گئی ورنہ سالک خود کو سالا کہنے پر مومن تراب کو لازمی نوکری سے نکال باہر کرتا۔

"یس مومن۔ کم ان پلیز۔" سالک نے کب سے کھڑے مومن کو الجھ کر اندر آنے کو کہا۔ وہ سٹپٹا کر فوراً اندر داخل ہو گیا۔

"تم ٹھیک تو ہو مومن۔ طبیعت صحیح نہیں لگ رہی مجھے تمہاری۔ کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ۔" وہ اپنے ہر ملازم کے لیے اتنا ہی فکر مند رہتا۔

"نو نو سر۔ ایم فائن۔ یہ فائل مانگی تھی آپ نے کل۔ وہی دینے آیا تھا۔ "راٹھور اینڈ کو" والی۔"

"او ہاں۔ لاؤ دکھاؤ مجھے۔ ان فیکٹ میں تم سے کہنے والا تھا کہ آج کل میں ایک میٹنگ ارینج کرو میری ان کے ساتھ۔ کچھ بہت ضروری پوائنٹس ہیں جو میں انڈر ڈسکشن لانا چاہتا ہوں۔" سالک حیران تھا کہ اس نے میٹنگ ارینج کرنے کو کیوں کہہ دیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ یہ بات نکل گئی تھی ورنہ کانٹریکٹ سائن ہو چکا تھا اور اب ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس پر مزید بات کرنے کی ضرورت تھی۔ پر کسی چہرے نے نگاہوں کے سامنے گھوم کر اس کے منہ سے یہ کہلوا دیا تھا۔ مومن کی باچھیں چر گئی۔ "راٹھور اینڈ کو" کے ساتھ میٹنگ۔ مطلب ماحور سے ملاقات۔

دونوں نفوس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور ایک ہی چہرے کا تصور ذہن پر چھایا تھا۔ دونوں ہی لڑکیوں کے معاملے میں ہمیشہ سے جمود کا شکار رہے تھے اور اب جس پر دل آیا تھا تو شدت سے آیا تھا اور ایک ہی پر آیا تھا۔ ماحور تغل بیک وقت دو دلوں کی لگامیں تھام چکی تھی مگر بے خبر تھی۔ اس سوئی ہوئی شہزادی کو ان دونوں میں سے کس شہزادے کے لمس نے ہوش میں لانا تھا، یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں بڑے انہماک سے کام میں مشغول تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ماحور آفس ورک میں اور ابرش فیس بک پر۔

ماحور نے ایک مصروف سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تو بے ساختہ مسکرا دی۔ ڈھیلی ہو کر چیئر پر جھولتی وہ کسی بھی دم سو سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی اور ایسا ہوتا تو ایک بار پھر اس کا موبائل بہت شاندار انداز میں اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر پٹاخ سے شفاف ٹائلز والے فرش پر گرتا اور اپنی کوئی ایک آدھ، چھوٹی موٹی ہڈی پسلی تڑوا لیتا۔ اتنے عرصے میں اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ ابرش بے حد سہل پسند ہے۔ وہ ماحور کو کسی فیری ٹیل کا کردار لگتی تھی۔ کوئی نرم دل شہزادی، جو مشقت نہیں اٹھا سکتی مگر اس

کا دل خلوص کا پیکر ہے۔

ان دونوں میں اب کافی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ نہ اب وہ اس کے لیے ''میم'' تھی اور نہ ماحور ایک عام ایمپلائی۔ بلکہ ابرش ایک آدھ بار اسے زبردستی اپنے گھر بھی لے جا چکی تھی۔ ابرش کی ماما بھی منکسر المزاج ایک گھریلو عورت تھیں جن کی ہر بات پر ٹوٹتی تھی "ایک تو یہ میری اولاد بھی نا۔ کسی کام کی نہیں۔''

لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی ہیں۔ گو کہ ''منصور راٹھور'' لیے دیے سے مزاج کے تھے مگر بناوٹ اور ذات کا تفاخر ان میں بھی نہیں تھا۔ ماحور کا دل لگتا تھا یہاں، اسے اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔ رائنہ کے بعد ابرش بہت تیزی سے اس کے قریب ہوئی تھی تو وجہ اس کے مزاج کا دوستانہ پن اور خلوص تھا۔

ابرش نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولے ہوئے تھی۔ ماحور نے اس کی طرف سے دھیان ہٹایا اور دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ جب ہی اچانک ابرش اپنی سیٹ سے اچھل کر تقریباً ٹیبل کے اوپر آ گری۔ ماحور اس افتاد پر سٹپٹا کر رہ گئی۔

''ہائے۔ ماہی کی بچی۔ مارے گئے۔ آج تو ماما نے جلدی گھر آنے کا کہا تھا مجھے۔ یار! تم یاد ہی کرا دیتیں مجھے۔ شام کو بہت خاص مہمان آنے ہیں۔''

''مجھے کیا الہام ہوا تھا کہ تمہارے ہاں مہمان آنے ہیں اور شام میں آنے ہیں تو تم ابھی کیوں اچھلیں؟'' اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ استفسار کیا۔

''اللہ کی بندی۔ سمجھا کرو نا۔ خاص الخاص مہمان ہیں جاناں۔'' اس نے شرمانے کی بودی سی ایکٹنگ کی، جس پر ماحور نے ناک چڑھا کر فوراً کہا۔

''زہر لگ رہی ہو۔ خیر شکر کرو کہ تمہاری ماما، تمہاری شادی کے لیے سیریسلی سوچ رہی ہیں۔

مہمان بھی اسی سلسلے میں ہوں گے نا۔''

''ہونہہ۔ وہ تو میں نے خود ہی خاص کہہ کر خاص بنا لیے ورنہ ماما نے ایسا کچھ نہیں کہا۔'' وہ زمانے بھر کی یاسیت لہجے میں سمو کر بولی۔

''اچھا ویسے ہیں کون اور شام کو آنے والے مہمانوں کے لیے صبح کے گیارہ بجے ہی گھر چلی ہو۔ سکون سے بیٹھو ابھی۔''

''بکواس نہیں کرو۔ ماما کے لیے نا سہی، میرے لیے یہ مہمان بہت اہم ہیں۔ ابھی گھر جاؤں گی تو تیاری کرتے کرتے شام ہو جائے گی۔''

''اچھا جی۔ کیسی تیاری۔ کچھ پتا بھی تو چلے۔ ایسے کون سے مہمان ہیں جن کے لیے اتنی تیاری کرنی پڑے گی۔ جلدی سے بتاؤ ورنہ کرتی ہوں آنٹی کو کال۔ انہی سے پوچھ لوں گی میں۔'' اس کے دھمکی نما انداز پر ابرش نے اسے گھورا پھر تھوڑا آگے کو جھک کر دانستہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''سالک پاشا کا پتا ہے۔ وہی پاشا انڈسٹریز کے مالک عادل پاشا کا اکلوتا بیٹا۔''

''ہاں۔ ہاں وہی جن کے ساتھ ہمارا کانٹریکٹ سائن ہوا ہے۔'' ماحور کو ایک دم یاد آیا، ساتھ ہی سالک پاشا کے ساتھ ہونے والا اپنا آخری ٹکراؤ بھی یاد آیا تو چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ابرش اپنی دھن میں بتانے لگی۔

''اس کی ماما ہیں نا۔ ان کی اسپیشل کال آئی ہیں۔ چونکہ بزنس ریلیشن شپ ڈویلپ ہو چکے ہیں تو سوچا کہ گھر والوں سے بھی ملاقات ہو جائے۔ اب تم خود سوچو ماہی! کوئی ایویں تو نہیں نہ آتا۔ یقیناً میرا جائزہ لینے آیا جا رہا ہے لیکن میری اماں کو یہ بات کون سمجھائے۔ ان کو یہی لگتا ہے کہ مجھ جیسی عقل سے پیدل کا کوئی ڈھنگ کا رشتہ آنا مشکل ہے اور اگر آیا تو گھی کے چراغ جلائیں گی۔ سوچ رہی ہوں کہ گھر جاتے ہوئے ایک کلو دیسی گھی کا کین بھی لیتی جاؤں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ماما کو یہ کام کرنا پڑے گا۔''

ماحور اس ساری بات کے دوران پوری تفصیل سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ جو سالک پاشا کا نام لینے سے ہی چمک اٹھا تھا۔ اسے دال میں کچھ کالا لگا اور اس کا اظہار بھی اس نے فوراً کر دیا۔

''ساری باتیں ایک طرف۔ مجھے محض یہ بتاؤ کہ کیا تم سالک پاشا میں انٹرسٹڈ ہو؟''

''ہائیں، لو۔ ایک سو ایک فیصد۔'' وہ بھی ابرش تھی۔ لگی لپٹی اسے بھی نہیں آتی تھی۔ جھٹ سے اقرار کر لیا۔ ماحور کھل کے مسکرائی اور بولی۔

''سو پر۔ بہترین چوائس ہے۔ لیکن تم کتنی گھنی ہو، مجھے اب بتا رہی ہو۔ کب سے چل رہا ہے تم دونوں کے بیچ یہ سب۔ ہاں بولو؟''

''کیا چل رہا ہے؟'' وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''خاک چلنا ہے۔ وہ تو سڑی شکل والا کھڑوس انسان ہے۔ اس کی تو شکل دیکھ کر میزائل خود بخود چل جائے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں چل سکتا۔ ہونہہ!'' وہ چہرے کے زاویئے بگاڑتے ہوئے بولی تو ماحور کو ہنسی آ گئی۔ تھا تو وہ واقعی ایسا ہی۔ ایک عجب بے نیازی تھی اس کی ساری شخصیت میں۔

''چلو اب اٹھو۔ جلدی کرو، چلیں اب۔'' ابرش فوراً کھڑی ہو کر ضروری چیزیں سمیٹ کر دراز میں ڈالنے لگی تو ماحور حیران ہو کر بولی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟ میں کہاں چلوں اور کیوں؟''

''تم میرے ساتھ میرے گھر چلو اور کیا۔ ذرا مل کر اچھی سی تیاری کریں گے ہائی ٹی کی۔ میری دوست ہو۔ ایسے موقعے پر دوست ہی دوست کے کام آتی ہے۔ چلو، چلو شاباش۔'' وہ تو جیسے رشتہ ڈن کیے بیٹھی تھی۔ ماحور کو بھی ساتھ چلنے پر آمادہ کر کے دم لیا۔ ویسے بھی اس کے پاس دوسرا آپشن نہیں تھا اس کی بات ماننے کے سوا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں گھر کی طرف روانہ ہو چکی تھیں اور سارا راستہ ماحور، سالک نامے سے محظوظ ہوتی رہی۔ ابرش کا سالک کی طرف اس قدر جھکاؤ دیکھتے ہوئے ماحور نے دل سے ان کے ملن کی دعا کی۔

☆☆☆

ابرش کے خوب صورت بنگلے میں حسبِ معمول پرسکون خاموشی گردش کر رہی تھی۔ وہ بڑی آہستہ روی سے ٹف ٹائلز کی روش پر چلتی ہوئی اردگرد کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ دونوں اطراف بنے ہوئے وسیع و عریض لان میں دودھ جیسے سفید پنکھوں والے مور پھر رہے تھے۔ یہ منظر بہت دلکش تھا۔ موروں کو اس قدر قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ماحور کو ابرش کے گھر ہی ملا تھا۔

ابرش تو کب کی اونچی اونچی تانیں اڑاتی اندر جا چکی تھی مگر اس کا جی کر رہا تھا یہیں لان میں سجی سفید کین کی کرسیوں میں سے ایک پر جا بیٹھے اور ان موروں کو دیکھتی رہے۔ لیکن چند پل بعد ہی ابرش اسے اپنے پیچھے نہ پا کر واپس آ گئی تھی اور دھکیلتی ہوئی اندر لے گئی۔ اس کی ماما بڑے تپاک سے ملیں، پاس بٹھا کر اس کا ہاتھ تھام کر سب حال احوال دریافت کیا اور آخر میں تان ابرش کی نالائقیوں پر جا ٹوٹی۔ وہ ایسی ہی سادہ لوح تھیں۔ انہیں بس سامع درکار ہوتا تھا جیسے ہی کوئی ہاتھ لگتا، وہ خوب بولتیں۔ شاید اتنے بڑے گھر میں سارا دن اکیلے، نوکروں کی فوج کے ساتھ گزار کر اوب جاتی تھیں۔ ایک ہی بیٹا تھا جو ہائر اسٹڈیز کے لیے باہر تھا اور ابرش آفس میں، تو ایسے میں ان کا وقت یقیناً بہ مشکل کٹتا ہوگا۔ کبھی کبھی ماحور سوچتی تھی کہ بھلا ابرش کے پاپا کو اتنا بڑا گھر بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ چار افراد اور چودہ کمرے۔ اف! اس کی نظروں میں اپنے گھر کے دو چھوٹے چھوٹے کمرے گھوم گئے۔ آنٹی کے دکھڑے سننے کے بعد وہ ابرش کے ساتھ اس کے بیڈروم میں چلی آئی۔

بہت خوب صورت اور نفیس کلر کامبینیشن سے سجا ابرش کا دل نشین کمرہ ماحور کے حواسوں پر چھا جاتا تھا۔ لائٹ پنک اور سلور کا نچ ہر چیز میں نمایاں تھا۔ فرنیچر سے لے کر پردوں تک اور کمرے کی چھت پر لگے فانوس سے لے کر قالین تک، ان ہی دو رنگوں

میں تھے۔ گول مسہری پر گول طرز کا نازک سا پنک اور سلور نیٹ کا باریک پردہ تھا۔ ایک سائڈ کی پوری دیوار آئینہ سے آراستہ تھی۔ اور اس شیشے کے چہار اطراف لگے چھوٹے چھوٹے اسپاٹس کی روشنی نگاہوں کو خیرہ کرتی تھی۔ ماحور ہر دفعہ مبہوت ہو جاتی تھی۔ اسے سچ میں یہ گمان ہوتا جیسے وہ کسی شہزادی کی خواب گاہ میں آ گئی ہو۔ وہ نرم اور ملگجی کاؤچ پر ٹک گئی۔

ابرش اسے بٹھا کر خود کسی کام سے باہر چلی گئی تو اس نے پیر اوپر چڑھائے اور ٹیک لگا کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے ذہن پر غنودگی چھا رہی تھی۔ کچھ ماحول کا اثر اور کچھ تھکن، وہ بڑی سہولت سے نیند میں چلی گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ کاؤچ پر باقاعدہ لیٹی ہوئی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر نظر آتے ڈریسنگ روم میں ابرش شیشے کے آگے کھڑی نک سک سے تیار اپنا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔ اسے بے دھیانی سے دیکھتے ہوئے ماحور نے اپنی کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اف! وہ اتنی دیر سوتی رہی اور احساس تک نہیں ہوا۔ ابرش نے اسے اٹھتا دیکھا تو اس کے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے بولی۔

"تم اتنے سکون سے سو رہی تھیں کہ میرا جی ہی نہیں چاہا تمہیں اٹھانے کو۔ پھر ماما نے بھی تمہیں دیکھا تو مجھے وارننگ دے دی کہ بچی کو اٹھانا مت۔ تمہارے پاؤں انہوں نے ہی اٹھا کر اوپر رکھے تھے اور سر کے نیچے کشن بھی وہی رکھ گئی تھیں۔ میں تو بس اپنی تیاری میں بزی رہی۔" شرارت سے کہتی وہ اپنے گالوں پر بلش آن کا نیچرل شیڈ اپلائی کر رہی تھی۔ ماحور کو بے حد شرمندگی نے آ گھیرا اور ایک بار پھر وہ ابرش کی ماما کی سادہ دلی کی قائل ہو گئی۔ اس نے جماہی روکتے ہوئے ابرش کا جائزہ لیا تو دل میں بے ساختہ ماشاء اللہ کہا۔ لائٹ براؤن اور ڈیپ ریڈ کے کنٹراسٹ میں وہ قیامت لگ رہی تھی۔ کچھ وہ بے حد گوری تھی اور کچھ اندرونی خوشی نے اس کے چہرے کو تابناک بنا دیا تھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں۔ جلدی بتاؤ۔" اس نے پورا گھومتے ہوئے ماحور سے سوال کیا۔

"اتنی حسین کہ اگر سالک پاشا ذرا سا بھی سینس ایبل بندہ ہے تو تمہیں چاہے بغیر نہیں رہ سکتا۔" ماحور نے خواب ناک لہجے میں جواب دیا تو ابرش خوشی سے جھومتی ہوئی اس کے قریب آ بیٹھی اور اس کے گھٹنے تھامتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔

"میرا دل رکھ رہی ہو یا سچ بول رہی ہو؟"

"میں سچ بول رہی ہوں کہ تمہارا دل سالک پاشا کو رکھ لینا چاہیے۔" اس نے بڑے سبھاؤ سے بات کو گھما کر کہا تو ابرش نے وفورِ جذبات سے اس کی پیشانی چوم لی۔ ماحور نے سٹپٹا کے اسے پرے دھکا دیا اور اٹھتے ہوئے بولی۔

"بے شرم نا ہو تو۔ تمہارا دماغ واقعی آج ٹھکانے نہیں ہے۔ چلو آؤ ذرا ٹیرس پر چلتے ہیں اسے ہوا لگوائیں۔" اس کا اشارہ ابرش کے دماغ کی طرف تھا۔ ابرش کھلکھلا کے ہنس دی اور اسے لیے اپنے کمرے کے آگے بنے چھوٹے سے ٹیرس پر چلی آئی جہاں چلتی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا نے دونوں کے ہی چہروں پر مسکراہٹ کھلا دی۔

مہمان کسی بھی وقت آنے والے تھے اور ابرش کو بے چینی سے ان کا انتظار تھا۔ وہ ریلنگ سے کمر ٹیک کر کھڑی ہو گئی اور نظریں گیٹ پر جما دیں۔ جبکہ ماحور سکون سے کرسی پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گئی اور موسم کا لطف لینے لگی۔ چھوٹی موٹی ادھر ادھر کی باتیں کرتے ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا جب گیٹ پر ہارن کی آواز گونجی اور چوکیدار نے گیٹ پورا وا کر دیا۔ بلیک لینڈ کروزر اندر داخل ہوئی اور ابرش کو بدحواس کر گئی۔

"آ گئے۔ آ گئے۔ ماہی آ گئے وہ لوگ۔ اللہ۔ میں ٹھیک تو لگ رہی ہوں نا۔ ادھر آؤ ناتم بھی۔ آؤ تم بھی دیکھو سالک کے پیرنٹس کو۔ آؤ نا۔"

ابرش، ماحور کو مسلسل بلا رہی تھی اور وہ تھی کہ آنکھیں موندے ہر چیز سے بے نیاز اپنے چہرے کو

چھوتی ہوا کے لمس کا مزا لے رہی تھی۔

سب سے پہلے عادل پاشا اترے اور پھر ناعمہ پاشا۔ جبکہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے سالک کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے ان دونوں کو ڈراپ کر کے کلب جانا تھا۔ عادل پاشا کو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس کام کے لیے وہ یہاں آئے ہیں اس کے لیے ان ہی کی مرضی اور منشاء کی ضرورت ہے نہ کہ سالک کی۔ یعنی اپنی دانست میں وہ یہ بھی ضروری خیال نہیں کر رہے تھے کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے سالک سے اس کی مرضی ہی پوچھ لیتے۔ لیکن ناعمہ نے ایک بار دھیمے انداز سے اسے ساتھ اندر چلنے کی آفر کی تھی۔ جسے وہ سرد مہری سے سن کے ٹال گیا۔ وہ ایک لمبا سانس لیتی عادل پاشا کے ساتھ ملازم کی معیت میں اندر کی طرف بڑھ گئیں اور سالک نے گاڑی ریورس گیئر پر ڈال کر ہارن دینا شروع کر دیا تاکہ چوکیدار گیٹ کھول دے۔

ٹیرس پر کھڑی ابرش نے جب سالک کو گاڑی بیک کرتے دیکھا تو اس کے منہ سے صدماتی کیفیت میں یہ جملہ نکلا۔

"وہ۔ وہ تو واپس جا رہا ہے ماہی۔ وہ اندر نہیں آیا۔ کیا فائدہ ہوا اس سب کا۔" اس نے ایک مایوس نگاہ اپنے سراپے پر ڈالی۔ ماحور اس کے لہجے کی نمی کو محسوس کرتے ہوئے پٹ سے آنکھیں کھول کر اپنی جگہ سے اٹھ کر ریلنگ کے قریب چلی آئی جہاں واقعی سالک پاشا کی گاڑی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ اس کے تجسی چہرے پر تاسف چھا گیا۔ عین اسی پل سالک کی نگاہ ٹیرس پر اٹھی اور پاؤں ایک جھٹکے سے بریک پر جم گیا۔ اس نے آنکھیں جھپک کر دوبارہ دیکھا تو تب بھی وہ دشمن جاں وہیں کھڑی ملی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے ہی دیکھ رہا ہے جسے کئی دن اور راتوں سے سوچ رہا تھا۔ میکانکی انداز میں اس نے اسٹیئرنگ وہیل گھمایا اور گاڑی واپس پورچ میں لا کھڑی کی۔

اوپر کھڑی ابرش یہ منظر دیکھ کر ایک بار پھر مارے خوشی کے ماحور کو لپٹانے لگی تھی کہ اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر فوراً اندر دوڑ لگا دی۔ ابرش بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی جس سے یہ خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی کہ سالک نے اسے ٹیرس پر کھڑا دیکھ کر اپنا واپسی کا ارادہ بدل دیا تھا۔ یعنی دل پر دستک پڑ چکی تھی، دروازہ وا ہونے کی دیر تھی بس۔ محبت کا پنچھی اپنے پنکھ پھڑ پھڑاتا اندر گھس کر بسیرا کر لیتا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں بڑی خوش گوار فضا چھائی تھی۔ کچن اور ڈرائنگ روم کے درمیان ڈائننگ روم حائل تھا پھر بھی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔ وہ دونوں بڑی مشاقی اور دلجمعی کے ساتھ خانساماں کی مدد سے چائے کی ٹرالی سیٹ کر رہی تھیں۔ ابرش ہر دو منٹ بعد ہاتھ کا پنکھا جھلاتی اپنے حواس بحال رکھے ہوئے تھی۔ ماحور نے اسے کچھ دیر بیٹھ جانے کو کہا اور خود باقی کا کام نبٹانے لگی۔ اگلے چند منٹ میں وہ دونوں ڈرائنگ روم کے پردے کے پیچھے ٹرالی لیے کھڑی تھیں۔ ماحور ٹرالی ابرش کے حوالے کر رہی تھی جبکہ وہ بضد کہ ماحور اس کے ساتھ اندر چلے۔ اسے غصہ آ گیا تو آواز دبا کر ابرش کو گھرکا۔

"تم واقعی عقل سے پیدل ہو۔ وہ لوگ پروپوزل لے کر نہیں آئے ابرش۔ کیوں نروس ہو رہی ہو۔ خدا کے لیے جاؤ اندر ٹرالی لے کر۔ اپنے آپ کو نارمل رکھو۔ میں کیا اچھی لگوں گی ٹرالی لے جاتی۔"

"پتا نہیں کیوں میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں ماہی۔ مجھ میں سالک کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ شرم سی آ رہی ہے۔"

اس سے پہلے کہ ابرش اپنے دوپٹے کا کونا منہ میں لے کر چبانا شروع کرتی، ماحور نے ایک جھٹکے سے اس کو ٹرالی سمیت اندر دھکیل دیا۔ مگر برا ہو اس گھڑی کا۔ ابرش تو اندر گئی سو گئی، ماحور کے اسٹول کا ٹسل حسب معمول اٹک گیا، ٹرالی کے پہیے ہیں اور الٹے قدموں ماحور بی بی بھی اندر کھنچتی چلی گئیں۔ عجیب مضحکہ خیز صورت حال تھی جس نے ان دونوں کو

خفت زدہ اور باقی سب کو محظوظ کر دیا۔ ابرش کے حلق سے بھنچا بھنچا سلام نکلا جس کا جواب بھرپور انداز میں دیا گیا۔ جبکہ ماحور آنکھیں میچے ابھی تک رخ موڑے کھڑی تھی۔ ابرش کی ماما نے فوراً اٹھ کر اس کی مشکل آسان کی اور اس کا اسٹول چھڑا کر اپنے بازو کے گھیرے میں لیے سب سے مخاطب ہوئیں۔

''اس سے بھی ملیے۔ ماحور! میری بیٹی کی بہت پیاری سہیلی۔ ویسے تو یہ منصور صاحب کی فرم میں جاب بھی کرتی ہے مگر مجھے یہ ابرش کی طرح ہی عزیز ہے۔''

ماحور نے نگاہ اٹھائی تو سیدھی سامنے بیٹھے سالک پاشا سے جا ملی جو یک ٹک اسے تک رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر نظر پھیری اور بائیں جانب ڈبل سیٹر پر بیٹھی ناعمہ پاشا سے نگاہیں جا ملیں۔ یک لخت اس کے حواسوں پر بجلی گری۔ اسے اپنی بصارت پر دھوکا سا محسوس ہوا۔ لیکن نہیں، وہ جو دیکھ رہی تھی، وہ حقیقت تھی۔ جان لیوا حقیقت! ناعمہ پاشا کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی مگر انہیں خود پر اختیار تھا۔ انہوں نے جھٹ اپنے تاثرات کو کنٹرول کر کے نارمل کیا۔ کسی نے محسوس بھی نہ کیا اور۔ ڈرائنگ روم میں معمول کی گپ شپ شروع ہو چکی تھی۔ منصور راٹھور اور عادل پاشا کے اپنے کاروباری موضوعات تھے۔ ابرش، ناعمہ پاشا کے پہلو میں جا بیٹھی تھی اور ناعمہ اب اس سے اور اس کی ماما کے ساتھ محو گفتگو تھیں۔ ماحور کو اپنا آپ اتنا ارزاں اور فالتو محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ جبکہ ابھی بھی دو آنکھیں ایسی تھیں جو مسلسل اس کا حصار باندھے ہوئے تھیں مگر اسے یہاں مزید رکنے کا یارا نہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور خاموشی سے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتی چلی گئی اور اس کے جانے پر سالک پاشا کے چہرے کی ساری رونق بھی ساتھ ہی چلی گئی۔ مگر ناعمہ پاشا کے اترے چہرے کو کوئی بھی محسوس نہیں کر سکا۔

☆☆☆

موسم قدرے تبدیل ہو چکا تھا اور دادا کا بیشتر وقت بھی صحن میں گزرنے لگا تھا۔ جب سے مومن نے کام والی ماسی شوکت کو ہی کچن کی ذمہ داری سونپ دی تھی تب سے دادا کے پاس جی جان سے فرصت ہی فرصت تھی۔ ماسی شوکت آتی تو دادا پورا گیٹ چوپٹ کھول دیتے اور خود صحن کے بیچوں بیچ کرسی ڈال کر بیٹھ رہتے۔ پتا نہیں ان کے دل میں کیا وسوسے تھے، شاید وہ کسی بھی محلے دار کو بات کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ دیواروں سے دیواریں ملی تھیں۔ لوگ آرام سے ایک دوسرے کے گھر جھانکا کرتے، ایسے میں دادا اپنی شرافت پر بٹا نہیں لگوا سکتے تھے۔ کام والی ماسی تو بہ امر مجبوری رکھی گئی تھی کہ اب اس کے بغیر واقعتاً گزارہ نہیں تھا وگرنہ دادا تو غیر عورت کی گرد بھی اپنے گھر نہیں آنے دیتے۔

دادا کے تحفظات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی شاویز کی بھابھی نے بے حد ایمان دار اور پھرتیلی کام والی لگوائی تھی۔ کپڑے، برتن۔ ہانڈی روٹی اور جھاڑو پوچھا۔ سب کام ڈیڑھ دو گھنٹوں میں نبٹا کر چلی جاتی۔ ایمان دار تھی اس لیے دادا بھی اسے دو گھنٹے کے لیے فری ہینڈ دے دیتے۔ شاویز تو صاف چڑاتا تھا کہ دادا، ماسی شوکت سے ڈرتے ہیں جب ہی گیٹ کھول کر بیٹھے رہتے ہیں تاکہ کوئی گڑبڑ ہو تو بھاگنے کی راہ میں رکاوٹ نہ آئے۔ ویسے دادا کو سچ میں ماسی شوکت کے مردانہ نام پر بے حد اعتراض تھا۔ اوپر سے بھاری جثے کی، وہ علیحدہ۔ دادا اکثر سوچتے کہ اسے اس کا خاوند کیسے بلاتا ہوگا۔ ''اوئے شوکت۔ نی شوکتے۔ وے شوکے۔'' اکیلے بیٹھے وہ اسی طرح کے جملوں کی پریکٹس کیا کرتے۔

ہفتے دو پہلے ہی مومن نے دادا کو اکیلے میں بڑبڑاتے سنا تو کہیں سے ایک پنجرے میں توتا رکھوا لایا۔ دادا کے ہاتھ اچھی مصروفیت آئی تھی۔ سارا وقت ان سے باتیں کرتے اور سوٹی پنجرے پر مار مار کر ان سے پوچھا کرتے۔ ''اوئے تم میں سے توتا کون ہے اور توتی کون۔'' اور پھر ایک دن انہیں شاویز نے پہچان کرائی تو دادا نے چھڑی اسی کی پیٹھ

پر گھمائی۔

''بے غیرت! تجھے بڑا پتا ہے۔ تو ان کا ماما لگتا ہے۔ توتے کے منہ والا۔ میں بڈھا ہو گیا مجھے تو آج تک پتا نہ چلا تو نے کون سی ڈگری لی ہے بھلا۔''

''ایم بی اے کی ڈگری مل جائے وہی غنیمت ہے دادا جی۔ اس کام کی سند آپ ہی کے پوتے کے پاس ہے۔ مومن نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جو ہرا والا بے غیرتوں کی طرح ہلکے پیلے کے پیچھے پیچھے پھدکتا رہتا ہے نا، بس یہی توتا ہے اور ہلکی پیلی رنگت والی توتی ہے اور پلٹ کے ٹھونگیں مارتی ہے تو یہ تو پکی زنانیوں والی عادت ہے۔ اب بولیے ان توتوں کا ماما کون ہوا بھلا؟'' شاویز آنکھیں گھما گھما کر پوری تفصیل بتا رہا تھا اور دادا ہنوز توتوں پر غور کر رہے تھے۔ انہیں اپنے پوتے کے اس قدر ایکسپرٹ ہونے پر اچنبھا ہوا تھا۔ اس دن سے دادا نے اس جوڑے کی حرکات وسکنات پر پوری نظر رکھنا شروع کر دی تھی۔ لیکن ایک دن صبح اٹھے تو چھوٹا سا گول انڈا ان کا خون جلا گیا۔

''بدقماش۔ لو بھلا بتاؤ۔ اتنی نظر رکھی پھر بھی داؤ لگا گیا کمینہ۔''

لیکن دادا نے پھر بڑی دیکھ بھال شروع کر دی اس انڈے کی۔ انہیں اس میں سے بچہ نکلنے کا بے چینی سے انتظار رہنے لگا۔ روز کی طرح آج بھی دانہ پانی ڈال کر انڈے پر ایک نظر ڈالی تو انہیں لگا وہ ٹوٹ چکا ہے۔ ان کو افسوس ہوا۔ تاسف سے سر ہلاتے پنجرے کے پاس سے ہٹے تھے کہ مومن اندر سے گیلے بالوں کو تولیے سے پونچھتا ہوا باہر نکلا۔

''کیا صورت حال ہے دادا۔ آپ کے پوتے نے اس دنیا میں آنکھ کھولی یا نہیں؟'' گیلے تولیے کو تار پر ڈال کر وہ پنجرے کے پاس آیا اور مذاق اڑاتا ہوا بولا۔ جس طرح دادا دن رات اس اکلوتے انڈے کا دھیان رکھے ہوئے تھے، مومن نے ازراہ مذاق اس انڈے میں سے نکلنے والے بچے کو دادا کا ہونے والا پوتا کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ چڑ جاتے تھے اور پھر دونوں میں کمال کی جنگ چھڑتی۔

''ٹوٹ چکا ہے انڈہ۔ کہا تھا نا زیادہ مت دیکھو، ٹوٹ جائے گا۔ وہی ہوا۔'' دادا نے افسوس سے کہا تو مومن لاپروائی سے شانے اچکاتے ہوئے بولا

''ہمم۔ اگر یہ انڈا ٹوٹ گیا ہے تو ہم اسے فرائی کریں گے یا آملیٹ ٹھیک رہے گا۔''

''خاگینہ زیادہ اچھا بن سکتا ہے۔ تھوڑا سا شاویز کے گھر بھی بھجوا دینا، اتنا زیادہ ہم دونوں کیسے کھا پائیں گے بھلا۔'' دادا کی چڑچڑاہٹ عروج پر تھی۔ ''اور تم اسے میرا پوتا کہنا بند کرو۔ میں نے کبھی تمہیں جتایا ہے کہ تمہاری تھوتھنی آسٹریلین توتے سے ملتی ہے۔ نہیں نا۔ تم بھی یہ بکواس بازی بند کرو کیونکہ سب میرے پوتے کے حوالے سے تمہیں جانتے ہیں۔ بات ذرا سی نکلی تو کسی نے آ کر اصل بات جاننے کی کوشش نہیں کرنی لیکن تم جدھر سے بھی گزرو گے نا محلے سے تو ''تو تا ای اوئے'' کی آوازیں کسیں گے سب تم پر۔''

مومن نے حیرت سے پلٹ کر دادا کو دیکھا۔ پھر جانچتی نظریں ان پر مسلسل جماتا ان کے قریب ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ دونوں کہنیاں گھٹنوں پر رکھیں اور مٹھیاں ٹھوڑی کے نیچے جماتے ہوئے بولا

''کیا معاملہ ہے۔ اداس ہیں یا غصہ میں ہیں؟''

''بے زار ہوں۔''

''کس سے؟''

''زندگی سے۔''

''اچھا جی۔ کیا بیاہ رچانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں۔ لیکن تیرا۔''

''میرا ہی رچا لیجیے لیکن لڑکی تو ملے کوئی۔''

''بکواس مت کرو۔ لڑکی ہے۔ تم سامنے لاؤ اب اسے۔''

''پر کتھوں۔ آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں نے اپنے کمرے میں چھپا رکھی ہے اور ابھی آواز دوں گا تو وہ چھم چھم کرتی باہر آ جائے گی۔ کیا دادا آپ

بھی نا۔"

"کمرے میں نہیں، تمہارے موبائل میں چھپی ہے۔ مجھے خود شاویز نے بتایا۔ سمجھے۔"

"یہ شاویز کا بچہ بھی ایک نمبر کا خبیث ہے دادا۔ بڑا آیا جاسوس۔ اتنی ہمت کب سے ہوگئی اس میں کہ میرا سیل چیک کر کے بتائے کہ اس میں لڑکی ہے۔ ہونہہ۔ ویسے تو جوس کے خالی ڈبے کا پٹاخا بجا دو تو کوسوں میں چلا جائے وہ۔ اور یہاں مجھ سے پنگے لینے کی کوشش کرتا رہتا ہے وہ۔"

"وہ کوئی پنگے نہیں لے رہا تم سے۔ میں نے ہی اسے معلوم کرنے کو کہا تھا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ تمہارا کسی لڑکی سے چکر ہے اور تم اس سے باتیں کرتے ہو۔ اب بند کرو یہ ڈرامے بازی اور مجھے سیدھی طرح اس کے گھر لے کر چلو۔ میں بات کروں اس کے ماں باپ سے۔"

"مجھے پہلے لڑکی سے تو بات کر لینے دیں۔" وہ بگڑ کے بولا تو دادا چمک کر تالی بجاتے ہوئے بولے۔

"یہ بات۔ دیکھا دیکھا۔ ہے نا لڑکی۔"

"ہے دادا۔ لیکن وہ ڈان ٹائپ کی ہے۔ مطلب یہ کہ۔ وہ اتنی روڈ ہے کہ میں آج تک اسے کچھ بھی اس حوالے سے کہہ نہیں سکا۔ وہ تو عام حالت میں ہتھے سے اکھڑی رہتی ہے، اگر میں نے اس سے رشتے کی بات کر دی تو میری گردن اڑا دے گی۔"

"تو تم کیوں کرو گے بے غیرت۔" دادا کو تاؤ آیا، ساتھ چھڑی کی نوک بھی چبھوئی۔ "دادا کو تاؤ ہے کیا۔ میں کروں گا۔ تم بس مجھے اس کا اتا پتا دو۔ باقی میرا کام ہے۔"

"لیکن دادا ایک پرابلم ہے۔" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"اس کے چار بہن بھائی ہیں۔ اس سے چھوٹے۔"

"تو؟" دادا نے بھنویں اچکائیں۔ "ہم نے گود لینا ہے کیا انہیں۔"

"یہ ان کی کفالت کرتی ہے دادا۔ اسی سارے گھر کا خرچ اٹھایا ہوا ہے۔"

"ہمم۔" دادا سوچ میں پڑ گئے، چند پل بولے۔ "چلو دیکھ لیں گے اس مسئلے کو بھی۔ رشتہ لے کے جائیں ہم۔"

"ایک اور بات بھی ہے دادا۔" اب کے آواز مزید دھیمی ہوگئی اور دادا مشکوک ہو کر اسے دیکھنے

"وہ۔ وہ ماحور کے بابا نشئی ہیں۔"

"ماحور کون؟" دادا نے پوچھا

"وہ لڑکی۔"

"اور نشئی کون؟"

"اس کے بابا۔"

"اوہ تو تجھے ساری دنیا میں نشئی کی بیٹی ہی تھی بے غیرت۔ اب اگر میں رشتہ مانگنے جاتا ہوں کیا بھروسا اس نشئی کا کہ ہاتھ میں چرس سے بھ سگریٹ پکڑے آئے اور باہر کا رستہ دکھائے..... ہوگئی تیری بھی مومن۔ جب متھا لگاتا ہے بروں سے ہی لگاتا ہے۔"

"اب میں نے سوچ سمجھ کے تو متھا نہیں لگا تھا نا دادا..... ورنہ جتنی تک چڑھی اور مزاج دار لڑکی ہے نا..... اسے تو کوئی منہ نہ لگائے..... متھا تو بعد کی بات ہے۔" وہ دادا کی گھوری سے بے نیاز بے تکان بول گیا۔ دادا نے کھنکار کے "حد ادب" کا سگنل دیا تو مومن اپنی کھسیاہٹ چھپاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اچھا چلیں۔ رشتہ بھی لے جائیں گے، پہلے مجھے اس سے بات کر لینے دیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ جائیں تو آگے سے کوئی نامناسب بات ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس تین دن کا وقت ہے، لڑکی تک مرضی پہنچاؤ ورنہ میری مرضی پر سر جھکاؤ۔ یہ مت سمجھنا کہ میں اب تمہیں ڈھیل دوں گا۔ اگر میں شاویز سے یہ پتا کروا سکتا ہوں نا کہ تم آج کل کن چکروں میں پڑے ہو تو اس لڑکی کے گھر کا پتا

بھی کرواسکتا ہوں۔'' دادا اسے چھڑی لہرا کر وارننگ دیتے اٹھ کر اندر جانے لگے۔ مومن نے سر ہاتھوں میں گرالیا تھا۔ دادا واپس مڑے۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو کر دادا کی شکل دیکھنے لگا۔

''ایسے مائنی انداز میں مت بیٹھو، جا کر لڑکی کی ماں سے بات کرو۔ کم از کم وہ تو سمجھ دار خاتون ہوں گی۔ سمجھاؤ سے بات کریں گی۔''

''ان سے بات کرنے کے لیے اگلے جہان کا ٹکٹ کٹانا پڑے گا دادا۔ فوت ہو چکی ہیں وہ۔''

''میرا دل تو کر رہا ہے کہ جوتے مار مار کر تیرا سر پولا کر دوں۔ کیسا لنڈا بنچا خاندان ڈھونڈا ہے تم نے۔ خدا کا واسطہ ہے مومن۔'' انہوں نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔ ''لڑکی کو منا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ اب بس اتنا ہی کر۔''

اور مومن ان کی بات پر تابع داری سے سر دھننے لگا۔

''اور سن۔'' دادا کو پھر کچھ کہنا یاد آیا۔ ''یہ انڈا تو اب ٹوٹ گیا ہے۔ نکال کر فرائی ہی کر کے دے دے مجھے۔''

مومن نے اپنا بالائی ہونٹ ''ہیں'' کہتے ہوئے اوپر چڑھایا اور بے ساختہ اٹھ کر پنجرے کے پاس گیا۔ چھوٹا سا پچکا ہوا انڈا اس کا دل خراب کر گیا۔ اونچی آواز سے ''یخ'' کہا اور پلٹ کے دادا کو دیکھا۔ وہ اندر جا چکے تھے۔ ایک لمبی سانس پھیپھڑوں میں بھر کر وہ واپس پنجرے کو دیکھنے لگا۔

''پتا نہیں ان میں سے توتی کون سی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ ہرے والی توتی ہو جو ہلکے پیلے والے طوطے کے پیچھے پڑی ہو۔ بے شرم نا ہو تو۔ کیسی شتر بے مہار ہے۔ خود ہی پھدک پھدک کے طوطے کے پیچھے جاتی ہیں پھر کہتی ہیں توتے بدمعاشی کرتے ہیں۔ حد ہے ویسے۔'' وہ بڑی عرق ریزی کے بعد یہ تجزیہ نکالنے میں کامیاب ہوا تھا کہ توتی نے ہی توتے کو پھنسایا ہے۔ لیکن دماغ مسلسل اسی مسئلے میں الجھا تھا کہ وہ ماحور کو کیسے پھنسائے۔

☆☆☆

وہ غائب دماغی کے ساتھ ایل ای ڈی کی بڑی سی اسکرین کی طرف متوجہ تھیں۔ جہاں ایک سیاسی پروگرام کی ہوسٹ چنگھاڑ چنگھاڑ کر بلائے گئے مہمانوں کا موقف رد کر رہی تھی۔ عادل پاشا ایسے پروگرامز کے شوقین تھے اور وہ ان کا ساتھ دینے پر مجبور۔ صرف ایک سالک کی ذات تھی جو اپنے باپ کے شوق کے آگے اپنی مرضی کھڑی کر سکتا تھا۔ مگر ایک عرصہ ہوا اس نے یہ عادت ترک کر دی تھی۔ ناعمہ جانتی تھیں کہ وہ ان کے وجود سے خوش نہیں اور انہی کی وجہ سے وہ عادل پاشا سے بھی دور ہو چکا تھا لیکن وہ ایسی بند گلی میں کھڑی تھیں جس کے آگے تو راستہ بھلے بند تھا مگر وہ پلٹ بھی نہیں سکتی تھیں۔ مسلسل ٹکٹکی باندھے رکھنے کی وجہ سے ان کی آنکھوں میں یک دم نمی سی اتر آئی جسے انہوں نے مہارت سے چھوٹی انگلی کی پور پر سمیٹ لیا۔

عادل پاشا جو آرام دہ اور کشادہ صوفے پر نیم دراز تھے، انہوں نے ذرا سا اٹھ کر شیشے کی خوب صورت سینٹرل ٹیبل سے سگار کا کیس پکڑا اور ایک سگار نکال کر اسے سلگایا۔ اس سارے عمل میں ان کی نگاہیں مسلسل ناعمہ پر جمی تھیں۔ وہ ان کے چہرے کو پڑھ رہے تھے۔ بلاشبہ انہیں اس کام میں بھی مہارت حاصل تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، سالک سیڑھیاں اترتا نیچے آیا۔ نیوی بلیو شرٹ کے ساتھ لائٹ براؤن پینٹ میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ عادل پاشا نے ایک بھرپور نظر اپنے ہینڈسم بیٹے پر ڈالی تو سینے میں سرور سا دوڑ گیا۔ وہ سیدھے ہو بیٹھے۔ خانساماں شام کی چائے اور لوازمات کی ٹرالی دے گیا تو ناعمہ سلیقے سے کپوں میں چائے انڈیلنے لگیں۔ ایک سرسری نظر انہوں نے بھی سالک پر ڈالی تھی اور زیر لب ماشاء اللہ کہا تھا۔ بس اس سے زیادہ کا حق وہ نہیں رکھتی تھیں۔

''کدھر کی تیاری ہے پرنس۔'' عادل پاشا نے محبت سے بیٹے سے پوچھا۔ سالک مسکراتا ہوا قریب

آیا اور قریب ہی صوفے پر ٹک گیا مگر انداز میں عجلت تھی۔ دائیں ہاتھ کی انگلی میں گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے بولا۔

"شیرازی آیا ہوا ہے نیویارک سے ابی۔ ایک ہفتہ ہو گیا مگر ملنے نہیں جا سکا۔ آج سب دوستوں کو اکٹھا کیا ہے اس نے۔ بس اسی کی طرف جا رہا ہوں۔"

"ہمم۔ دیٹس گڈ۔ اس کے باپ کو میرا اسلام کہنا اور میسج دینا کہ کلب میں ملے۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتا اٹھنے لگا تو عادل پاشا فوراً بولے۔

"ارے ایک منٹ بیٹھو یار۔ باپ سے بھی چار باتیں کر لیا کرو۔"

سالک مسکراتا ہوا واپس بیٹھ گیا۔ انداز ہمہ تن گوش والا تھا۔ عادل پاشا نے ناعمہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھاما، جو ہمیشہ کی طرح منظر سے اجنبی سی کر دی گئی اور محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"تمہیں یاد ہے سالک۔ یہ وقت ہم دونوں کا صرف ہم دونوں کے لیے ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جب تمہاری مما زندہ تھیں تو انہیں بھی ہم لفٹ نہیں کرواتے تھے اور وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر اپنی نٹنگ باسکٹ پاس رکھے مسلسل بڑبڑائے جاتی تھیں۔ خانساماں ہمارے لیے چائے اور اسنیکس لا لا کر بوکھلا جاتا تھا۔ کیرم کی بازی اور شطرنج کی چالیں میں بہت مس کرتا ہوں سالک۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولتے ماضی میں سفر کر رہے تھے، سالک بھی چند پل کو سب کچھ بھلائے ان کے ہمراہ ہو لیا تھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر خوش گوار یادوں نے مسکان بکھیر دی۔ لیکن یہ محض چند پل کی بات تھی۔ ماں کی یاد آتے ہی سالک کے لب سکڑ گئے تھے اور نظریں بے ساختہ ناعمہ کی جانب اٹھی تھیں۔ اس کی شکوہ کناں نگاہوں کو محسوس کر کے چائے کا کپ ان کے ہاتھ میں لرزا۔ وہ اب تک اس معاملے میں مجرم گردانی جاتی تھیں جس میں ان کا سرے سے قصور نہیں تھا۔ انہوں نے دھیان بٹانے کے لیے ٹیبل رکھا میگزین اٹھا لیا اور بڑے انہماک سے اسے دیکھتی ہوئی چائے کے سپ لینے لگیں۔

"وقت گزرتا ہے تو طبیعت اور مزاج تبدیل ہو جاتے ہیں ابی۔ مما چلی گئیں تو اپنے سب شوق بھی لے گئیں۔ چلیں خیر۔ کبھی لگائیں بازی بھی۔ فی الحال تو آپ کہیں، کیا کہنا ہے معنی خیز جملہ کہہ کر اس نے باپ کی توجہ دوسری میذول کروائی۔ ساتھ ہی ساتھ کلائی پر بندھی گھ کو بھی دیکھا۔

"مجھے منصور راٹھور کا گھرانہ بہت پسند آیا۔ کاروباری تعلق کو رشتے داری میں بدلنے کا فیصلہ ہے میں نے۔"

"کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھا۔" سالک نا سمجھی سے باپ کے چہرے کو جانچا۔ عادل پاشا چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا اور بالکل سیدھے ہو بیٹھ ناعمہ کے بھی کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"مطلب یہ مائی سن۔ کہ مجھے منصور راٹھور بیٹی ابرش بہت پسند آئی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آ سے تمہاری شادی ہو۔ سمپل۔" جتنے آرام سے عاد پاشا نے ساری بات کہہ سنائی تھی اتنے آرام سے چند لمحوں کے توقف سے سالک پاشا کا جواب ان سماعت سے ٹکرایا۔

"نو۔ اٹس ناٹ دیٹ سمپل ابی! مجھے ہرگز ابرش سے شادی نہیں کرنی۔ میں اس میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔"

ایسے ہی جواب کی توقع ناعمہ کر رہی تھیں ا سے اور ویسے ہی ردعمل کی امید انہیں عادل پاشا تھی جو انہوں نے اس کا جواب سن کر دیا تھا۔

"میں نے پوچھا نہیں ہے بیٹا۔ بتایا ہے۔ ا میں پوچھا کرتا تو بہت سے لوگ وہاں نہیں ہوتے جہاں وہ ہیں۔ میری بات کا مطلب بھی سمجھ ہی ہو گے سالک۔" سالک بخوبی سمجھ گیا تھا اور ایک سرا

ی نگاہ ناعمہ کے خاموش وجود پر پڑی تو ان کے کانوں کی لویں تک خفت سے سرخ ہو گئیں۔ یہ شارہ انہی کی طرف تھا۔ انہیں کبھی بھی ان باپ بیٹے کا موضوع گفتگو بننا پسند نہیں تھا۔ وہ جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرنے لگیں۔ ان کا ارادہ منظر سے غائب ہونے کا تھا۔

''یہی آپ کو سمجھانا چاہ رہا ہوں ابی کہ یہ میری زندگی ہے اور اس میں، میں اپنی مرضی کے لوگ شامل کروں گا۔'' باپ بیٹا آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھے۔ لہجے سرد اور چہرے پر تپش تھے۔ ''اور جسے میں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں وہ بھی وہیں تھی۔ ماحور نام ہے اس کا۔ ابرش کی فرینڈ اور ان کی کمپنی کی ایمپلائی ہے۔ بس وہی میری پسند ہے اور اسی سے میری شادی ہوگی۔ اور آپ مجھے بھی جانتے ہیں کہ میں تو نہ پوچھا کرتا ہوں اور نہ بتاتا ہوں، بس کر گزرتا ہوں۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ناعمہ کا سر بری طرح سے چکرایا، انہوں نے فوراً کپ ٹیبل پر رکھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے سالک کو دیکھے گئیں مگر وہ متوجہ نہیں تھا۔ اس نے کوکیز جار سے ایک کوکی نکالا اور چھوٹی سی بائٹ لیتے ہوئے بولا۔

''میں چلتا ہوں اب۔ بہت دیر ہوگئی۔ آپ کو اگر ماحور کا ایڈریس وغیرہ چاہیے تو مجھ سے کہیے گا، میں دے دوں گا۔ آخر رشتہ لے کر تو آپ ہی کو جانا ہے۔ چلتا ہوں۔ سی یو۔ بائے۔''

وہ چلا گیا اور عادل پاشا سلگتی نظروں سے اس کی پشت دیکھتے رہ گئے۔ جبکہ ناعمہ کی حالت مسلسل غیر ہو رہی تھی۔ یہ بس وہ ہی جانتی تھیں کہ سالک کی پسند انہیں کس مصیبت سے دوچار کرنے والی ہے۔

☆☆☆

''اس اسٹوپڈ سے پوچھو رائنہ۔ اسے ہوا کیا ہے۔ تین دن ہو گئے اسے آفس سے لیو لیے ہوئے۔ کالز کر کر کے میں تھک گئی، لیکن مجال ہے جو اس لڑکی نے ایک بھی کال اٹینڈ کی ہو۔ اس دن سے جو یہ میرے گھر سے ایک دم فرار ہوئی ہے، یقین مانو آج شکل نظر آ رہی ہے اس کی۔ وہ بھی گھر سے اغوا کرنا پڑا ہے ورنہ یہ تو ایسے منہ چھپا کے بیٹھی ہے جیسے مایوں کی دلہن ہو۔'' ابرش تیز تیز بولتی ماحور کے لتے لے رہی تھی اور اتنی ہی تیزی سے اس کا اسٹرا مسلسل سلش سے بھرے گلاس میں گھوم رہا تھا۔ جبکہ ماحور ٹھس سی بیٹھی ٹیبل پر نظریں جمائے بہت پژمردہ سی دکھ رہی تھی۔

رائنہ نے ایک لمبا سپ لے کر اس کے چہرے کی طرف نظر کی اور بھانپ گئی کہ وہ وجہ نہیں بتائے گی یا پھر کم از کم ابرش کے سامنے نہیں بتائے گی۔ اتنے عرصے کی دوستی میں وہ اس کے مزاج کے کئی پہلو جان چکی تھی۔ مارے باندھے ساتھ آئی ماحور کو ابرش نے زبردستی گھر سے پکڑ کر گاڑی میں ڈالا تھا اور ساتھ رائنہ کو بھی گھسیٹ لائی۔ اب اس مال کے فوڈ کارنر کی قدرے سائڈ ٹیبل پر بیٹھی تھیں ان تینوں کے آگے سلش کے فل سائز گلاسز رکھے تھے جنہیں ابرش اور رائنہ تو پوری دلجمعی سے پی رہی تھیں لیکن ماحور نے اپنے گلاس کو چھوا تک نہیں تھا۔ اس کی ذہنی حالت اس دن سے مخدوش تھی، جس دن سے وہ ابرش کے ہاں سے واپس گھر لوٹی تھی۔

واپسی کا یہ سفر اس نے کس طرح طے کیا تھا، اسے یہ تو یاد نہیں تھا پر گیٹ کھلتے ہی سیف کے گلے لگ کر وہ جس طرح چھپک چھپک کر روئی تھی، وہ اسے ضرور یاد تھا۔ سیف نے بہ مشکل اسے خود سے لگائے بستر تک پہنچایا اور بڑی محبت سے اس کا سر سہلاتے ہوئے اسے لٹا دیا۔ نہ کچھ پوچھا نہ کریدا، کیونکہ وجہ وہ بخوبی جان گیا تھا اور پھر جب تک ماحور سو نہ گئی، وہ اس کے پاس سے ہلا تک نہیں تھا۔ ریان، زونی اور جنت کو بھی اس نے خود ہی کھانا گرم کر کے کھلا دیا۔ اگلے دن ماحور کی طرف سے سیف نے چھٹی کی درخواست بھجوا دی تھی۔ درخواست دو دن کی تھی اور آج تیسرا دن تھا ماحور کو آفس گئے ہوئے۔ اور اب ابرش کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا اسی لیے آج وہ گھر

پہنچ کر اسے زبردستی ساتھ کھینچ لائی تھی۔ وہ کڑے تیوروں سے ماحور کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''اب منہ سے کچھ پھوٹو گی ماہی یا نہیں۔''

''نہیں۔'' جواب رائنہ کی طرف سے آیا تھا۔

''وجہ؟'' ابرش کا جارحانہ انداز۔

''ایویں۔'' رائنہ کا ڈھیلا سا جواب۔

''یار میرا دماغ مت گھماؤ۔ ایک تو میں پہلے ہی بہت ٹینس ہوں اپنی نہ ہونے والی شادی کو لے کر۔ اوپر سے تم لوگ مجھے مزید ستا رہی ہو۔'' ابرش روہانسی ہوتے ہوئے اس انداز میں بولی کہ۔ رائنہ کو بھرے منہ کے ساتھ بری طرح سے ہنسی آئی اس نے ہاتھ کے اشارے سے پہلے ابرش کو سامنے سے اٹھایا۔ وہ ناسمجھی سے اسے دیکھتی ایک سائڈ پر ہوگئی۔ رائنہ کے منہ سے سلش کا فوارہ سا نکلا جو سیدھا اس کرسی پر پڑا، جہاں محض چند پل پہلے ابرش تھی۔ اس حرکت پر بے ساختہ ماحور کے ہونٹ کھلکھلائے تھے۔

''آخ۔تم.....تم..... رائنہ کی بچی۔ اگر چار سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی نا مجھے یہاں سے اٹھنے میں، تو یہ دھار مجھ پر وار دیتیں تم۔ ایڈیٹ۔'' ابرش بے یقینی سے گیلی کرسی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''تب ہی تو تمہیں پورے چار سیکنڈ پہلے ہی اشارے سے اٹھا دیا میں نے پاگل۔ اوپر سے باتیں سنا رہی ہو۔ چلو اسی بہانے ماہی تو ہنسی۔'' رائنہ نے ابرو سے ماحور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اسی اثناء میں ابرش پچھلی ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ چکی تھی، یہ دیکھے بغیر کہ ایک موٹی سی آنٹی اسی کرسی پر بس تشریف رکھنے ہی والی تھیں مگر عین وقت پر انہیں پتا چل گیا کہ کرسی کی جگہ اب محض خلا ہے اور گرنے سے بچ گئیں۔

''اب اس سے یہ بھی پوچھو نا کہ اسے آخر تکلیف کیا ہوئی تھی جو بتا بتائے اس دن میرے گھر سے یوں بھاگی جیسے بھوت دیکھ لیے ہوں۔ شاید یہی بات اس کھڑوس سالک کو بری لگی جب ہی پانچ منٹ بعد وہ بھی چلا گیا۔'' منہ بسور کر کہتی وہ معصوم لگ رہی تھی۔ ماحور نے رشک سے اس کے چہرے کو دیکھا جس پر پریشانی کی کوئی لکیر نمایاں نہ تھی۔ پھر فوراً ہی خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''ریان کا ٹیکسٹ آ گیا تھا۔ ''فوراً گھر آؤ ورنہ بابا سارا گھر بیچ دیں گے۔'' ''بس اسی لیے میں کچھ بھی بتائے بغیر گھر آنا پڑا۔'' اس کے جواب پر ابرش نے ناسمجھی سے اور رائنہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اس قدر ذہنی پراگندگی کا شکار تھی کہ یہ تک بھول گئی کہ ابرش کو یہ نہیں معلوم کہ اس کے بابا جوئے کی لت میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ کریدے گی تو کیا کہے گی۔ وہ تو بھلا ہو ابرش کا جو بات کی تہہ میں جانے کی زحمت کبھی کرتی ہی نہیں تھی اس نے ناسمجھی سے کاندھے اچکا دیے اور اب اس کی توجہ اسٹارٹ ہو چکی تھی، ہر بات میں اسی دن کا تذکرہ تھا۔ رائنہ نے ماحور کے چہرے کی طرف دیکھا جو اذیت سے بھنچا ہوا تھا۔

''اف رائنہ! گریس تو اس شخص پر ختم ہے۔ کوتو سالک پاشا کی پرسنالٹی ایزاے ہول بہت اچھی لگی ہے اور اوپر سے اس کی مدر۔ یعنی میری ہونے والی ساس۔'' وہ شرمانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''ہائے! قسم سے۔ اس عمر میں اتنی کمال نظر آتی ہیں تو جوانی میں کیا غضب ڈھاتی ہوں گی۔ مجھے حسرت ہوئی کہ کاش میں بھی ان کی عمر میں پہنچ کر ایسی ہی خوب صورت نظر آؤں۔''

''یار ابرش۔'' رائنہ نے اسے بیچ میں ٹوکا۔ ''اتنی لمبی بات بغیر کچھ کھائے پیے ہضم نہیں ہو رہی۔ اور پھر تمہارا یہ سالک نامہ سننے کے لیے انرجی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا پہلے کچھ کھلاؤ پھر سناؤ۔'' رائنہ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ منہ بناتی اٹھ کر کاؤنٹر پر برگر لینے چلی گئی۔ وہ انہیں ساتھ زبردستی لے کر آئی تھی، اس لیے نخرے بھی اسے ہی سہنے تھے۔ اس کے جاتے ہی رائنہ نے ماحور کا اکڑا ہوا ٹھنڈا ہاتھ تھاما اور پیار سے پوچھا۔

''کیا تم نے انہیں دیکھا ہے ماہی؟ کیا سالک پاشا ان ہی کا بیٹا ہے؟''

''نہیں ہے۔ نہیں ہے وہ ان کا بیٹا۔ کیسے ہوسکتا ہے۔ کیا بیٹا کہہ دینے سے کوئی اولاد ہو جاتا ہے؟'' وہ ایک دم تیز آواز میں بولی تو رائنہ نے اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے کہا۔

''کول ڈاؤن ماہی۔ ہم پبلک پلیس پر ہیں۔''

''مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں۔ میں کسی کو جواز دینے کی پابند نہیں۔ مجھے تو اپنے زندہ رہنے کا جواز سمجھ میں نہیں آتا رائنہ! کیا..... کیا وہ سب ذمہ داریاں میری تھیں جنہیں میں نے نبھایا۔ کیا اس بات کا کسی کے پاس کوئی جواز ہے۔'' آنسو قطرہ قطرہ بہہ نکلے۔ رائنہ نے تاسف سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھا۔ لائٹ گرے آنکھیں آنسوؤں سے بھری اس قدر قیامت خیز لگ رہی تھیں کہ کوئی اور وقت ہوتا تو خود رائنہ ہی اسے چھیڑے بنا نہ رہتی۔ مگر وہ حالات کی ستائی ہوئی تھی، کوئی خوش کن بات بھی اسے زیادہ دیر تک خوش نہیں کر پاتی تھی۔ اس نے بے دردی سے آنسو صاف کیے اور التجائیہ لہجے میں رائنہ سے کہا۔

''پلیز۔ مجھے اس وقت اکیلا چھوڑ دو۔ میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں، مجھے مرمت کی ضرورت ہے جو میں خود ہی کر سکتی ہوں۔ تم پلیز ابرش کو سمجھا لینا۔ اور اسے کہنا صبح میں آفس آؤں گی۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور مڑ کر ناک کی سیدھ میں چلتی چلی گئی۔

اس کی پشت کو تکتے ہوئے رائنہ مسلسل سالک پاشا اور اس کے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ابھی اسے ابرش کو ماحور کے واپس جانے کی ٹھوس وجہ بھی بتانی تھی ورنہ وہ ہرگز پیچھا نہ چھوڑتی۔ سلش کے تقریباً خالی گلاس میں اسٹرا گھماتے ہوئے اس نے اپنی نظریں وہاں جما دیں جہاں سے ابرش ہاتھوں میں برگرز اور کوک کے ڈسپوزایبل گلاسز کی ٹرے تھامے اردگرد سے بچتی بچاتی واپس آرہی تھی۔

''تمہیں بھی عشق کرنے کے لیے سالک پاشا ہی ملا تھا ابرش۔''

اسے دیکھتے ہوئے رائنہ بے چارگی سے بڑبڑائی تھی۔

☆☆☆

شام ڈھل چکی تھی۔ سورج ساری مخلوق کی کرتوتوں پر روشنی ڈالنے کے بعد انہیں اب تاریکی کے حوالے کر کے جا چکا تھا۔ اسے یونہی پھرتے پھراتے بہت وقت ہو گیا تھا لیکن اس کے پیروں کو پھر بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ پتا نہیں اصل بے چینی کہاں تھی۔ دل دماغ حتیٰ کہ ہر ہر عضو تکلیف میں مبتلا تھا۔ سوچیں، سوچیں اور بس سوچیں۔ اس نے سر پر تکلیف دہ یادوں کا گٹھڑ اٹھا رکھا تھا جسے اتارنے کے لیے اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی مگر کون تھا بھلا جو اس کا بار بانٹ لیتا۔ وہ اس وقت ایک پارک کی باؤنڈری وال کے باہر سے گزر رہی تھی۔ اونچے جنگلے کے پیچھے اب خاموشی اور قدرے تاریکی کا راج تھا۔ جھینگروں کی آتی تیز آوازوں نے یک دم اس کو ہوش کی دنیا میں کھینچ لیا۔ اس نے چونک کر اردگرد نگاہ ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا۔ جس طرف وہ نکل آئی تھی، یہاں ایریا خاصا سنسان تھا۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ چلتے بے دھیانی میں وہ پارک کی پچھلی طرف نکل آئی تھی۔ اونچے اونچے اور موٹے موٹے تنوں والے درخت اس کا دل دہلا رہے تھے۔ وہ وہیں سے مڑی اور تیز تیز چلتی بلکہ تقریباً بھاگتی ہوئی اسی راستے پر واپس ہولی۔ لیکن وہی ہوا جس کا خوف تھا۔ کچھ ہی آگے گئی تھی جب اپنے پیچھے کسی اور کے قدموں کی چاپ سنی۔ اس کا دم حلق میں آ گیا۔ نگاہوں کے سامنے وہ کریہہ منظر گھوم گیا جب مختار انصاری سے جان بچا کر بھاگی تھی۔ لیکن قسمت اچھی تھی کہ مومن ٹکرا گیا پر ضروری تو نہیں کہ ہر بار تقدیر ساتھ دے۔

اس کی ٹانگیں کانپنا شروع ہو گئی تھیں اور چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ تیز تیز چلنے کے چکر میں

پاؤں رکھ کہیں رہی تھی، پڑتا کہیں تھا۔ پتا نہیں کوئی چرسی تھا، نشئی تھا یا چور۔ جو اس کے پیچھے اتنی ہی تیزی سے چلا آرہا تھا۔ اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر کوئی ایسی شے ٹٹولنے کی کوشش کی جو بوقت ضرورت دفاع کے لیے استعمال ہو سکے مگر الم غلم کاغذوں سے بھرے ہینڈ بیگ میں ایک بال پوائنٹر تک نہیں تھا جس کی نب وہ اس پیچھا کرنے والے آوارہ آدمی کی آنکھ میں گھسو سکتی۔ اس نے بے بسی سے ایک نظر اپنی خستہ حال سینڈل پر ڈالی اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کی مدد سے وہ کتنا تیز بھاگ سکے گی۔ ایک بار وہ رونق والے علاقے تک پہنچ جاتی تو اس خبیث انسان کو مزا چکھا دیتی۔ اس نے اللہ کا نام لے کر دوڑ لگا دی پر اپنے پیچھے صاف محسوس کیا کہ کوئی اور بھی بھاگ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہراس پھیل گیا۔ اپنے بہن بھائیوں کے چہرے نگاہوں میں پھرنے لگے تو بے ساختہ دل سے دعا کی۔

''یا اللہ! مجھے بچا لے، اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بہن بھائیوں کا کیا بنے گا۔''

اس نے مزید تیز بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ ایک گول موڑ مڑتے ہی سڑک کراس کرنے کا ارادہ کر رہی تھی جب عین اسی لمحے پارک کی باؤنڈری وال کے ساتھ لگ کر سوئے ہوئے کتے کو ہوش آ گیا۔ جتنی تیزی سے یہ اس کے قریب سے گزر کر بھاگی تھی، اتنی ہی تیزی سے وہ کتا اس کی جانب لپکا۔ ماحور نے پلٹ کر ایک نظر کتے کو دیکھا اور دوسری نگاہ اس ہیولے پر ڈالی جو تقریباً اس سے دو فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ زمین آسمان اور اس کے اوسان یوں گھومے کہ آنکھوں کے آگے سب گڈمڈ ہو گیا۔ خدا جانے پہلے اس تک کون پہنچتا۔ اپنے پیچھے کتے کی غراہٹ سنتے ہی وہیں سڑک کنارے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی اور اونچا اونچا چلانے لگی۔ اس وقت بدحواسی میں اسے یہی آخری حربہ بچاؤ کا دیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے سر جھکائے چلائے جا رہی تھی۔

چلائے جا رہی تھی جب کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یک دم چیخوں کو بریک لگاتے ہوئے اسے پہلا خیال کتے کا ہی آیا۔ مگر اگلے ہی پل یہ سوچ کر رد کر دیا بھلا کتا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہے گا کہ ''بی بی! تمہیں کاٹ لوں۔''

کتا نہیں تھا تو پھر وہی چرسی، نشئی یا پھر چور تھا۔ ماحور اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔ نہ سر اٹھایا نہ جسم ہلایا۔ مگر گلے کو دوبارہ چلانے کے لیے تیار کرنے ہی لگی تھی جب کانوں میں جانی پہچانی سی آواز پڑی۔

''ماحور۔ ماحور اوپر دیکھو۔ یہ میں ہوں۔ مومن تراب۔''

دل میں یک بیک سکون سا اتر آیا۔ یوں لگا جیسے کھلے آسمان سے یک دم سائبان تلے آ گئی ہو۔ اللہ سے شکر گزاری کا احساس نس نس میں گردش کرنے لگا جس نے عین وقت پر مومن کو اس کی مدد کے لیے بھیج دیا تھا ورنہ بے خیالی میں یہاں تک آنے کی جو غلطی وہ کر بیٹھی تھی، اس کا خمیازہ کسی بھی صورت بھگتنا پڑ سکتا تھا۔ یہ تو اتفاقاً مومن نکل آیا، کیا بنتا جو سچ میں کوئی لچا لفنگا اس کے پیچھے اس ویرانے میں لگ جاتا۔

''ماحور۔ تم فوت نہیں ہوئی، یہ مجھے پتا ہے۔ اب سر اٹھاؤ اور میرا شکریہ ادا کرو جلدی سے۔ ورنہ آج وہ کتا تمہیں کاٹ کر ایک آدھی بوٹی لے گیا ہوتا تمہاری اور یہیں کہیں جھاڑیوں میں اپنی محبوبہ کو پیش کر کے شوخیاں مار رہا ہوتا۔'' وہ مومن تراب تھا، جسے سیدھے سبھاؤ بات کرنی آتی ہی نہ تھی۔ لیکن ہر بار یہ بھول جاتا تھا کہ مقابل بھی ماحور مغل تھی جو نسلاً انا پرست تھی۔ ادھار رکھنا شان کے خلاف جانتی تھی۔ اس وقت بھی خاموش رہ جاتی تو ایک عرصے تک جواب نہ دینے کا قلق ستاتا رہتا۔ ویسے بھی مومن کو اپنے قریب پا کے ہوش حواس سب نارمل اور تڑخ کے بولی۔

''تمہارا شکریہ ادا کروں اور وہ بھی میں۔ میں

یعنی کے ماحور مغل۔ ہونہہ۔ ایک تو اپنے لفنگے یار کو میرے پیچھے لگایا اوپر سے میری مدد کرنے کا ناٹک کر کے اچھے بنے چلے ہو۔ واہ۔ میں نے کہا واہ۔"

"ہا.....!" جواباً اسی لہجے میں مومن کے منہ سے نکلا تھا۔ "یار! کون سا یار۔ میں تو اکیلا ہوں۔" اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"وہ کتا۔ اور کون۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی تو مومن کو آگ ہی لگ گئی۔

"کتا.....اور میرا دوست۔ تم نے ایک کتے کو میرا دوست کہا۔ ایک کتے کو؟" صدمے سے اس کی آنکھیں پھٹی جارہی تھیں۔

"نہیں۔ تم آسانی کے لیے ایسے بھی سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے دوست کو کتا کہا۔" ماحور نے ہاتھ جھاڑ کر قدم آگے بڑھائے۔ مومن نے اس آٹھویں عجوبے کو سر سے پیر تک گھورا اور جی لگا کے اسے زیر لب الو کی..... کہا۔ لیکن اس زیر لب کی بھی آواز اس کے باریک کانوں تک پہنچنے نہیں دی ورنہ اس کے اپنے زیر زمین جانے کے پورے چانسز تھے۔ وہ سر جھٹک کے تیز چلتا ہوا اس کے قریب ہوا اور قدم سے قدم ملانے لگا۔ خاموشی سے۔ اسے محسوس کرتے ہوئے۔ زیر لب مسکراتے ہوئے۔ وہ مسلسل کالی سینڈل سے دکھائی دیتے اس کے سفید پیروں کو دیکھتا قدم گن رہا تھا۔ ہر ہر قدم کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بندھی تھی جیسے۔ یہ لمحے بڑے انمول تھے کیونکہ ان لمحوں میں فقط خاموشی تھی جو ان دونوں کے بیچ حائل تھی، ورنہ وہ اسے پورے جذبے سے محسوس کررہا تھا۔

ماحور نظریں جھکائے ناک کی سیدھ میں چلتی اس کے جاگرز میں جکڑے پیروں کو دیکھتی سوچ رہی تھی کہ اگر آج بھی یہ شخص نہ پہنچتا تو اس وقت وہ کس حال میں ہوتی۔ وہ اس کا مسیحا بن کے سامنے کیوں آجاتا تھا۔ یا پھر نگہبان۔

مومن نے اچک کے اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی جو سر کے گرد لپٹے اسٹول کی آڑ میں ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر لمبی سانس بھرتے ہوئے ٹھوکر سے پتھر اڑایا۔

ذہن بے اختیار ان گھڑیوں کے گرد چکرانے لگا جب اس نے شاویز کے ساتھ ڈھابے پہ بیٹھے۔ اسی کے پیسوں کی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے، قریب سے ماحور کو گزرتے دیکھا۔ وہ اردگرد سے بے نیاز اور روٹھی ہوئی سی اپنے دھیان میں چلتی جارہی تھی۔ مومن فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور شاویز کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے ہولیا۔ اس کی چھٹی حس اسے خبردار کررہی تھی کہ ماحور اس وقت نارمل نہیں تھی۔ اسے سنسان راستے کی طرف جاتا دیکھ کر ایک بار تو ناگواری کی لہر سی اس کے اندر اٹھی۔

"یہ لڑکی یقیناً بچپن میں سر کے بل گری تھی، اسی لیے عقل دب گئی۔" تپش سے سوچتا وہ ابھی بھی اس کے پیچھے تھا۔ لیکن جب قریب سے گزرتی اکا دکا گاڑی اور موٹر سائیکلوں کے ہارن پر بھی اس نے اپنا جھکا سر نہیں اٹھایا اور نہ ہی بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا تو صحیح معنوں میں مومن کو تشویش لاحق ہوئی۔ وہ نہ جانے کن سوچوں میں مستغرق تھی کہ اسے یہ تک احساس نہ تھا کہ چلتے چلتے وہ کس ویران رستے پر نکل آئی ہے۔ گو کہ یہ پبلک پارک کی بیک سائڈ تھی مگر ایک تو رات ہوچکی تھی، دوسرے یہ ایریا پررونق تھا، نہ ہی رہائشی۔

آخر ایک جگہ پہنچ کر ماحور رکی اور چونک کر اردگرد کا جائزہ لیا تو مومن نے فاصلے سے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑتے محسوس کیا تھا۔ اسے واپس اسی راستے پر پلٹتے دیکھ کر مومن فوراً ایک درخت کی آڑ میں ہوا تھا۔ کچھ لمحے بعد ماحور بی بی بھاگتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ مومن کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ رینگی اور پھر اس نے شرارتاً اپنے اپر کاہڈ سر پر ڈال کر پیشانی سے ذرا نیچے تک کھینچا اور اس کے عقب میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ ماحور کو اپنے پیچھے کسی کے آنے کا شک گزرا۔ اس نے پلٹ کر انسانی ہیولے کو دیکھا اور اگلے ہی پل دوڑ

لگا دی۔ مومن نے بھی شرارتاً اس کے پیچھے بھاگنا شروع کیا مگر ذرا آگے ہی ان دونوں کو رکنا پڑا کیونکہ ایک آوارہ کتا بائیں طرف سے نمودار ہوا اور خواہ مخواہ میں شوخا ہوتا ماحور کی جانب لپکا تھا۔

''اوہ تیری! اس کتے کے بچے نے بھی ابھی ہی آنا تھا۔'' یہ گالی مومن نے کتے کو دی تھی۔ ہمیشہ سے کتوں سے اس کی جان جاتی تھی۔ جس گلی میں اسے کتے کے ہونے کا احتمال ہوتا، وہاں سے وہ راستہ بدل لیا کرتا تھا۔ مگر آج یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ منحوس تیزی سے ماحور کی طرف بڑھا اور ماحور نے ڈر کے مارے وہیں بیچ سڑک پر گھٹنوں میں سر دے دیا۔ اس کی دبی دبی چیخوں کی آواز بہت عجیب لگ رہی تھی۔ مومن کو جو بھی کرنا تھا فوراً کرنا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے پیٹ پر پھیر کر اسے تھپتھپایا کیونکہ اسے یقین تھا کہ چودہ ٹیکے ٹھکیں گے آج اور پھر اللہ کا نام لے کر تیزی سے ہیروانہ انداز میں بھاگتے ہوئے کتے کے قریب گیا اور زوردار کک اس کی کمر پر رسید کی۔ کتا بے چارہ چوں چاں کرتا دم دبا کر نکل گیا۔

مومن جی ہی جی میں بے حد نہال کہ آخر کار آج اس نے ایک چول سے کتے کو مار بھگایا ورنہ آج تک کتا اسے بھگاتا آیا تھا۔ ماحور کی مسلسل آتی چیخوں کی آواز نے اسے زیادہ دیر فخر نہیں کرنے دیا۔ بلکہ اگلے چند منٹوں میں ماحور نے تو سرے سے اس کا احسان بھی ماننے سے انکار کر دیا تھا جو اس نے بروقت یہاں پہنچ کر کیا تھا اور گردن اکڑاتی اب وہ ایک بار پھر آگے آگے تھی اور مومن پیچھے پیچھے۔

ایک بات تسلیم کرنے میں اسے کوئی عار نہیں تھا کہ نخرا اور ناز، ماحور پر جچتا تھا۔ وہ حسین تھی لیکن بے خبر تھی۔ نزاکت و رعنائی اس کی ہر ادا سے چھلکتی تھی مگر وہ اس سے یکسر انجان تھی۔ اس کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے مومن کو یہ اعتراف تھا کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہے۔ پہلے جسے وہ وقتی جذبہ جان کر نظر انداز کرتا رہا تھا، دراصل وہ وقتی تھا ہی نہیں۔ ماحور کی محبت اس کے دل پر ہمیشگی نقش ثبت کر چکی تھی۔

وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا حیثیت اختیار کر چکی ہے مگر اس کے لٹھ مار انداز سے خائف تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ یہاں وہ اس سے دل کی بات کہے اور وہاں وہ چپیڑ کھینچ مارے۔ لیکن آج کم از کم وہ اسے اشارتاً بتا کے رہے گا، ورنہ دادا اس کی چٹنی بنا دیں گے۔ اس نے دل کڑا کر کے فیصلہ لیا اور گلا کھنکار کے تیز تیز چلتی ماحور کو متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کی، ویسے وہ پہلے ہی تمام حسیات سمیت اس کی جانب متوجہ تھی۔ ساتھ چلتے اس اونچے چوڑے مرد کو وہ کن انکھیوں سے کئی بار دیکھ چکی تھی۔ بلیک پینٹ پر گرے اپر پہنے، ہڈ سر پر گرائے۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں پھنسائے اور اپر کے بازو کلائیوں سے اوپر چڑھائے وہ اتنا ہی ہینڈسم تھا جتنا اس کے کالج کی لڑکیاں دیکھ لیتی تھیں تو انجمن بنی ہو کے بھرا کرتی تھیں۔ یا پھر اگر ابرش مومن کو دیکھ لیتی تو اسے سالک پاشا اور مومن تراب میں سے چوز کرنا مشکل ہو جاتا۔

سالک پاشا کا خیال آتے ہی اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ جس طرف سے دھیان بٹانے کی سعی کرنے کے لیے وہ کب سے سڑکوں کی خاک چھان رہی تھی، وہ سب دوبارہ اس کی روح کو جھنجوڑنے لگا۔ آنکھوں کی جلن گیلے سیال کی صورت ٹپکی تو مومن کی نگاہ سے چھپ نہ سکی۔ اس نے اچنبھے سے اس کے گال پر ٹھہرے آنسو کو دیکھا تو بے اختیار اپنے داہنے ہاتھ کی انگشت کی پور مسل کر رہ گیا۔ مگر اس کے اس طرح رو دینے سے صدمہ سا ہوا تھا۔ جتنا وہ اسے جان پایا تھا وہ بہت بہادر اور مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی۔ اس کے تو کبھی لہجے میں تھکن نہیں اتری دیکھی تھی کجا کہ آنسوؤں سے اس کی ہار کا اظہار ہو۔ اس نے فکرمندی سے اپر کی پاکٹ میں سے سیل فون نکال کر وقت دیکھا۔ ابھی سات بج کر تیرہ منٹ ہوئے تھے لیکن سردیوں کے دن تھے اس لیے جلد اندھیرا ہونے کی وجہ سے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کتنی رات ہو چکی۔ اس نے تھوڑا آگے جا کر اچانک ماحور

کا ہاتھ تھاما اور ایک سائڈ پر بنے ٹوٹے ہوئے سیمنٹ کے بینچ کی اور لے گیا۔ وہ حیران سی اس کے ساتھ بنا مزاحمت کھنچتی گئی، منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ بینچ پر بیٹھ کر اس کا ہاتھ چھوڑا اور نرم لہجے میں پوچھا۔

''اب بتاؤ کیا ہوا۔ دیکھو یہ نہ کہنا کہ کچھ نہیں۔ کیوں کہ کچھ ہوا ہے جس نے آج تمہیں یوں سڑکوں سڑکوں پھرا ڈالا اور پھر رلا ڈالا۔ پلیز ماحور۔ بھول جاؤ کہ تمہیں مجھ سے چڑ ہے۔ بھول جاؤ کہ میں کون ہوں۔ صرف یہ سوچو کہ میں تمہاری ایسی سہیلی ہوں جس کے سامنے تم اپنے اندر کا ہر دکھ کہہ سکتی ہو۔''

ماحور نے آنسو بھری نگاہوں سے ایک بار اس کی جانب دیکھا اور پھر بے بسی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی۔ آج امی کی بہت یاد آرہی ہے۔ بس۔''

''نا ئیں۔'' مومن نے نہیں کو لمبا کر کے نفی میں سر ہلایا۔ ''اچھا چلو۔ اپنی بہن سمجھ لو۔ ہاں بھائی مت سمجھنا بس۔ اللہ کا واسطہ!''

اس کے التجائیہ کہنے پر ماحور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔ مومن نے اپنے اندر تک تازگی اترتے محسوس کی۔ اس کا دل چاہا کہ اس کی مسکراہٹ کی تعریف کرے۔ اور اس خواہش پر اس نے عمل بھی کر ڈالا۔

''تمہیں پتا ہے ماہی۔ میرا مطلب ہے ماحور۔'' اس کے گھور کر دیکھنے پر اس نے فوراً تصحیح کی۔ ''تمہاری مسکراہٹ ایسی ہے جیسے..... جیسے..... جیسے.....'' ماحور نے دلچسپی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو آنکھیں چندی کیے مثال سوچ رہا تھا۔ ''جیسے۔ تین گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ کے بعد ایک دم چل پڑنے والے پیڈسٹل فین کی ہوا۔ آہا.....!'' اس نے اپنی تشبیہہ کا خود ہی مزا لیا لیکن ماحور کا اس تعریف پر منہ ایسا بن گیا جیسے کسی نے زبردستی اس کے منہ میں نبولی ٹھونس دی ہو۔ اس نے کندھے سے بیگ اتار کر دونوں ہاتھوں میں تھاما اور کس کے اس کے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حنا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-

سوچ نگر کی رانی

رضیہ جمیل

قیمت -/350 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

کندھے پر دے مارا۔

''یہ..... یہ تعریف کی ہے تم نے میری یا لوڈشیڈنگ کا رونا رویا ہے۔ تمہیں تو کسی لڑکی کو سراہنا بھی نہیں آتا مومن تراب۔ کل کو بیوی کی تعریف کرنی پڑی تو گوگل سے مدد لینا۔ سمجھے۔'' اس کا تپا تپا سا لہجہ مگر پرسکون تاثرات مومن کا روم روم شانت کر گئے۔ اس نے میکانکی انداز میں دوبارہ سے بیگ مارنے کے لیے اٹھے اس کے دونوں ہاتھ نرمی سے جکڑے اور اس کی آنکھوں میں آنکھوں ڈالتے ہوئے بولا۔

''اب میں اتنا بھی اناڑی نہیں۔ تمہیں کس نے کہا کہ مجھے بیوی کی تعریف کرنی نہیں آئے گی۔ بیوی بننے سے پہلے تم میرے بارے میں ایسی رائے قائم نہیں کر سکتیں۔ ماہی!''

اس کا گمبھیر لہجہ اور آواز کا اتار چڑھاؤ۔ ماحور کی سانسیں تک تھم گئیں۔ جسم کا سارا خون ٹھاٹیں مارتا جیسے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ اسے مومن سے اتنی جلدی ہرگز بھی اظہار کی توقع نہیں تھی۔ وہ اس کی نگاہوں کے پیغام سے بے خبر نہیں تھی، انجان بننے کا ڈھونگ تھا بس۔ اس نے گھبراہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے دونوں ہاتھ چھڑائے اور لرزتے قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ مومن بھی بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ ہولیا۔ دونوں کی دھڑکنیں باتیں کرنے لگیں۔ گھر آنے تک ماحور نے دوبارہ مومن کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ دل کی کیفیت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ اسے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسا محسوس کر رہی ہے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اسے کچھ بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔ ناہی مومن کی اس بات پر غصہ آیا تھا۔ گھر کے گیٹ پر پہنچ کر جیسے ہی ماحور نے ہاتھ بڑھا کر بیل دینا چاہی، مومن نے اسے پکارا۔

''میں نہیں جانتا کہ تم مجھے پسند کرتی ہو یا نہیں۔ لیکن میں تمہیں چاہنے لگا ہوں ماہی۔ پوری شدت سے۔ میں آئندہ زندگی کا ہر پل تمہارے ساتھ بتانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں تمہارے تمام [illegible] اور نارسائیوں کے ساتھ اپنانا چاہتا ہوں تاکہ تم [illegible] تمہیں رسائی مل جائے۔ ہم مل بانٹ لیں اپنا کچھ۔ تم سکھ لے لینا، میں تمہارے دکھ چن لوں گا۔ طرح ہم دونوں جیے جائیں، جب تک سانس ہے وقت تھم گیا تھا یا پھر اس کی دھڑکنیں۔ وہ ہر شے بھول۔ اپنے حالات، اپنے اطراف۔ ہر شے۔ بس سامنے تو مومن تراب۔ اپنی وجاہت اور سچے جذبات ساتھ۔ اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ مومن نے بے سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر وہیں رک گیا۔ ماحور کا محلہ تھا۔ یہاں پر کا کوا بنتے دیر نہیں لگتی۔ سرگوشیانہ انداز میں مخاطب ہوا۔

''اگر آنسو چننے کی پریکٹس تم مجھے ابھی کر چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن بعد میں ہو کہ اپنے بھائیوں سے پٹوا دو۔''

اور وہ روتے سے ہنس دی۔ مومن گیلی آنکھ تلے کا یہ منظر دیکھ کر محض ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

''آج رات تم صرف مجھے سوچتے ہو گزارو۔ صرف مجھے۔ اگلی بار جب میں ملوں گا مجھے یقین ہے کہ تمہاری آنکھوں میں میرا ہی عکس گا۔ مومن تراب کا۔''

وہ بڑے یقین سے کہتا واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ ماحور کے لب مسکرائے اور اس نے شرارتاً سے پکارا۔

''اتنا یقین اچھا نہیں ہوتا۔ کیا پتا میں رات لیٹوں اور مجھے تمہاری شکل یاد ہی نا آئے۔''

''ہونہہ۔ ایویں۔'' بنا پلٹے اس نے اونچی آواز میں کہا اور چلتا چلا گیا۔ راستے میں آتے ہر اچھوتے بڑے پتھر کو ٹھوکر سے اڑاتا۔ سیٹی پر ''آوارہ ہوں'' کی دھن بجاتا، چوڑے شانوں والا مومن تراب ماحور کی نگاہوں میں ہمیشہ کے لیے سما گیا تھا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ